کرشن چندر

ایک خیال رہا کہ ادب اور ادب نواز لوگ کسی ادیب کو اُس کی زندگی میں وہ عزت نہیں دیتے جس کا وہ اہل ہوتا ہے ۔ لیکن کرشن چندر کے متعلق یہ خیال غلط ثابت ہوا ہے۔ کرشن چندر اپنی زندگی ہی میں اپنی مقبولیت اور ادب میں اپنی قدر و منزلت دیکھ رہے ہیں۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی اور ادیب اس قدر محبوب اور مقبول ہو۔ کرشن چندر کو کہانیوں کا شہنشاہ کہا جاتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کرشن چندر کے چند نئے افسانوں کا انتخاب ہے جو پہلی بار کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

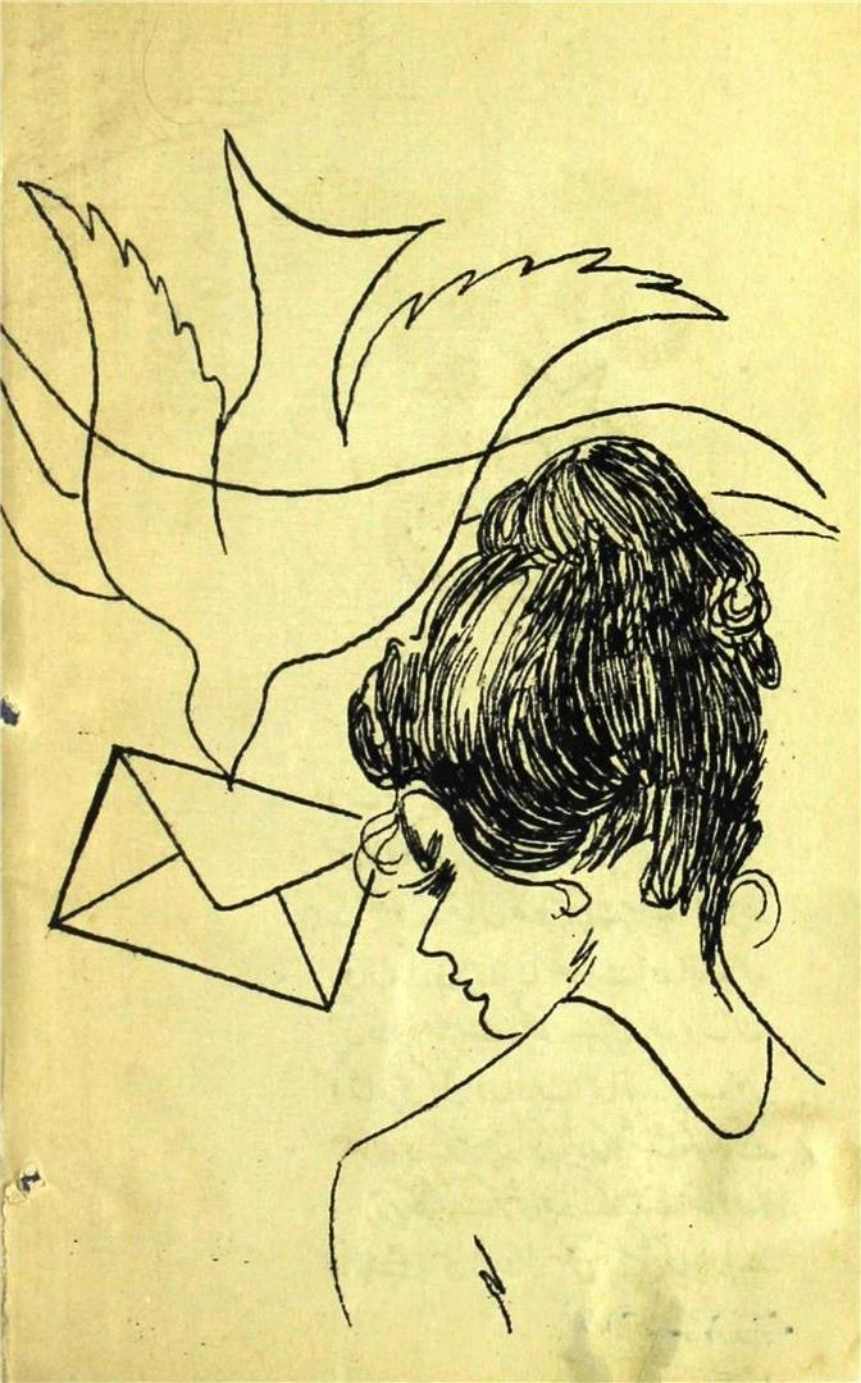

میں باعزت طریقے سے رہنے کا حق منوالیا تھا۔ کیونکہ جھونپڑیوں میں رہنے والے بنیادی طور پر غریب آدمی تھے اور ایک دوسرے کا حق سمجھتے تھے۔

جھونپڑی میں رہ کر مدن نے پریم لتا کو ساتھ لے کر ایک اسٹوڈیو سے دوسرے اسٹوڈیو کے چکر لگانے شروع کئے۔ دن گزر گئے، مہینے گزر گئے چکر لگاتے لگاتے فاقے شروع ہوئے۔ پہلے نقدی ختم ہوئی۔ پھر پریم لتا کے زیور بکے۔ پھر قیمتی ساڑھیاں۔ پھر کم قیمتی ساڑھیاں۔ آخر میں مدن کے پاس صرف ایک قمیض رہ گئی، جو اس کے بدن پر تھی۔ اور پریم لتا کے پاس صرف ایک ساڑھی اور ایک بلاوز، اور وہ بھی پشت سے پھٹ گیا تھا۔!

"آپ کا ڈریس آیا ہے" ایک اسسٹینٹ ڈائریکٹر اندر آگیا اور بآواز بلند بولا۔

اور مدن خواب خرگوش سے جاگا اور اس نے دیکھا کہ اسسٹینٹ ڈائریکٹر کے ہمراہ ایک درزی ہیروئن کا نیا ڈریس لے کر چلا آرہا ہے۔ جامنی رنگ کا اطلسی غرارہ، زردوزی کے کام کا بنارسی کرتا اور بلوشفان کا دوپٹہ۔ سنہرے گوٹے کے لہریوں سے جھلمل جھلمل کرتا ہوا۔ ڈریس کے اندر آتے ہی محسوس ہوا گویا میک اپ روم میں ایک فانوس روشن ہو گیا ہے۔

ہیروئن میک اپ ختم کر کے ڈریسنگ روم میں لباس بدلنے کیلئے

اُس کے خط پتر کا جواب نہ دے؟ تجھ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر تو بڑا ادیب ہے تو اپنے گھر کا ہوگا۔ ہم بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ چشمِ ماروشن دلِ ما ناشاد۔ ہم تجھ سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اِدھر بھائی وِنڈ میں میری نگینہ بیکری ہے۔ بالے دی ہٹی ہے۔ ابھی پچھلے ماہ میں نے اینٹوں کا بھٹہ بھی چالو کر دیا ہے اور اب پُل کے ٹھیکے کے لئے ٹنڈر بھر رہا ہوں۔ تو اپنے آپ کو ایشیا کا عظیم ادیب لکھواتا ہے۔ ابے تیرے ادیب کی ساری ایشیائی کھول کر رکھ دوں گا۔ کیا سمجھا ہے۔ تیرے ایسے ایسے دس ادیب اور رائٹر میں اپنے پیشاب کی دھار میں بہا سکتا ہوں! سالے ۔۔ دلّے ۔۔ دے پتر۔ تیری ۔۔۔۔ نوں ۔۔۔ نکال میرا سوٹ کا کپڑا۔

کدھر ہے وہ گرم کپڑے کا ٹکڑا۔ جو میں نے تجھ کو پہلے خط کے ساتھ بھیجا تھا۔ نہیں تو خود میں بمبئی آکر تیرا مزاج ٹھیک کرتا ہوں

بقلم خود
گھسیٹا رام

تمام شد

اب تک مطبوعہ

سٹار پاکٹ بکس

نئی کتابیں

نیل کمل (ناول) گلشن نندہ ۲/=	من کے میت (ناول) عارف مارہروی ۱/=
بے ننگ و نام " عادل رشید ۲/=	ایک انسان ایک رہنما۔ صدر کنیڈی کی باتصویر کہانی "
کبوتر کے خط (افسانے) کرشن چندر ۱/=	نوید سحر۔ امریکی آئین اور قوم کی کہانی "
تائیس محل (جاسوسی) اکرم الہ آبادی ۱/=	مطربہ (شاعری) قتیل شفائی "

مندرجہ ذیل کتابیں ایک روپے میں

ناول

درد کی نہر	کرشن چندر	ویران راہیں	عادل رشید
گدھے کی واپسی	"	دو سائے	"
میں اکیلی	گلشن نندہ	کبوتری	"
کالی گھٹا	"	دل کتری	"
شیشے کی دیوار	"	لرزتے آنسو	"
ٹوٹے پنکھ	"	دُلہن	"
گناہ کے پھول	"	فرشتہ	"
تین یکے	"	جمالِ دل	"
ساون	عادل رشید	دیدۂ تر	"
آہٹیں	"	اندھیرا اُجالا	خواجہ احمد عباس
چند تصویر بتاں	"	ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی
		سودائی	عصمت چغتائی

تیرا میرا غم	کرشن گوپال عابد	امراؤ جان ادا	مرزا رسوا
تخت نشین بلی	اکرم الہ آبادی	بُری بات	گورودت
پرنس آف رنجن گڑھ	〃	انتظار	زکی انور
مردہ بازار	〃	شرمیلی	〃
چیلنج	〃	نیل کنٹھ	جمنا داس اختر
بے سر کی لاشیں	〃	رادھا الزبتھ	〃
خونی بادل	〃	بگولے	〃
موت کے بعد	〃	جلن	〃
دنیا موت کی مٹھی میں	〃	رات گزرنے والی ہے۔ جی ایس عالم	
جنکشن بلارا	〃	سمٹتے سائے	جگدیش بھارتی
جرسِ لاہوت	〃	پیار پر تو بس نہیں	〃
پُراسرار سایہ	〃	کیسے کوئی جیئے	بھادواج
گونج	〃	پانی کی دیوار	〃
شاہکار	〃	پتھر کے صنم	〃
رجنی	عشرت رحمانی	دولت کے کھیل	خان محبوب طرزی
ستم پرستم	سعید امرت	پونم کا گیت	رنبیر
دل کے اندھیرے	〃	پردیسی	〃
تنہائیاں	عارف ماہروی	بدنصیب	وحشی محمود آبادی
دغا باز	〃	ایک پھول ایک کانٹا	مضطر ہاشمی
صبح کا بھولا	〃	چندر لوک	〃
ہار جیت	ایم اسلم	اور صبح ہو گئی	〃

قطرے سے سمندر تک	جگدیش چندر بجلی
بے گناہ	بدنام رفیعی
موتی کی لاش	〃
بے سروپا	〃
عشق کے ہاتھوں	〃
دلکش ویرانے	جمیل انجم
برف کا درد	اپندر ناتھ اشک
پہلا سال	یگیہ دت
جال	منمتھ ناتھ گپت
کانچ کے ٹکڑے	مسافر لائلپوری
عشق نہ دیکھے	کوثر چاندپوری
پرائی ماں	نانک سنگھ
دھرتی کا لہو	〃
سونے کی عورت	راقم صدیقی
دو آوازیں	امرتا پریتم
ڈاکٹر دیو	〃
یہ گھاؤ یہ پھول	وشوا ناتھ درد
پیار اور پیسہ	راجہ رام شاستری
زلزلہ	ٹیگور
نئے نئے چاچا جی	
وہ کون تھا؟	
آئے دو طوفان	
چار کلیاں	
ماں	

ترجمے

قیدی عورت اور سیلاب	

کہانیاں

مس نینی تال	کرشن چندر
گیہوں اور گلاب	خواجہ احمد عباس
کہتے ہیں جس کو عشق	〃
لمبی لڑکی	راجندر سنگھ بیدی
سجا ہوا کمرہ	او۔ ہنری
کابلی والا	ٹیگور

شعر و شاعری

تلخیاں	ساحر لدھیانوی
گاتا جائے بنجارا	〃
ساحر اور اس کی شاعری	پرکاش پنڈت
شکیل بدایونی کی رومانی شاعری	ڈاکٹر شکیل الرحمان ایم۔ اے (ڈی لٹ)

شوکت تھانوی کی مذاحیہ شاعری — شوکت تھانوی
غالب اور اُس کی شاعری — نریش کمار شاد
میرا کلامِ منتخب — 〃
دیوانِ غالب — مرزا غالب
ظفر کی غزلیں — بہادر شاہ ظفر
مجاز اور اس کی شاعری — پرکاش پنڈت
یادیں! — اختر الایمان
کہیں دیپ جلے کہیں دل — شکیل بدایونی
رنگینیاں — 〃
صنم و حرم — 〃
دھرتی کو آکاش پکارے — 〃
رعنائیاں — 〃
گلہائے پریشاں — فراق گورکھپوری
نغمہ نما — 〃
روپ — 〃
قطرات و قلزم — جوش ملیح آبادی

کہکشاں — جگن ناتھ آزاد
چورنگ — گوپی ناتھ امن
تماشائی — کرشن موہن
نذرِ بتاں — جاں نثار اختر
تارِ گریباں — 〃
چشمِ بد دور — حسرت جے پوری
ابھی تو میں جواں ہوں — انتخاب
چاندنی اور پھول
(خواتین کی شاعری)
اُردو شاعری — انتخاب
کلامِ ریاض — ریاض خیرآبادی
گلہائے سب رنگ — (اشعار)
ہمیں تو لوٹ لیا — (قوالیاں)
کلامِ اختر شیرانی — اختر شیرانی
غزلیں اور نظمیں — (انتخاب)
رباعیات — 〃

متفرق

طلسم ہوشربا

الف لیلےٰ
تماشہ (ڈرامے) نارنگ
اخبار کا دفتر پرکاش پنڈت
تبسم (کارٹون وطیفے)
قصہ طوطا مینا
اِک کرن اُجالے کی
راجگوپال اچاری

اندھیرا مٹاؤ دیا جلاؤ
صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشن
ہماری عادتیں ہمارے جذبات
دیانند ورما
ہم کامیاب کیسے ہوں؟
سویٹ مارڈن
گلستاں شیخ سعدی

مندرجہ ذیل ناول دو روپے قیمت میں

سیوا سدن منشی پریم چند
ایک گدھا نیفا میں کرشن چندر
سانجھ کی بیلا گلشن نندہ
نیل کمل "
پائل جمنا داس اختر

چاندی کا گھاؤ کرشن چندر
اندھیرے چراغ گلشن نندہ
مادھوی "
پتھر کے ہونٹ "
ایک ندی دو پاٹ "

ملنے کا پتہ

سٹار پبلیکیشنز، ۲۷۱۵، دریا گنج دہلی ۶

پنجابی پستک بھنڈار کی چند مطبوعات

لندن کے سات رنگ	(کرشن چندر)	۳/-
لوفر	"	۲/-
چاندی کا گھاؤ	"	۴/-
ایک گدھا نیفا میں	"	۴/-
چراغ بولتے ہیں	عادل رشید	۶/۵۰
بہو بیگم	"	۵/۵۰
شہر کے پھول	"	۵/-
زندگی کا سفر	"	۴/۵۰
انتقام		۴/-
دردِ دل		۳/-
آخری سلام		۵/-
شبِ غم		۵/۲۵
چودھویں کا چاند		۲/۲۵
اس پار	مضطر ہاشمی	۵/۲۵
شیشۂ دل	زکی انور	۳/-
دھوپ چھاؤں۔	عارف مارہروی	۳/-
بے ایمان		۳/-
کب صبح ہوگی		۵/-
دہلیز		۴/۵۰
بلندیاں		۳/۵۰
نیل کنٹھ	گلشن نندہ	۶/۵۰
میں اکیلی	"	۳/-
کانچ کی چوڑیاں	"	۳/-
کلنکنی	"	۳/-
سسکتے ساز	"	۶/-
دوچھایا	"	۴/-
نیل کمل	"	۴/۵۰
ایک سوال	امرتا پریتم	۲/۵۰
پائل کے زخم	نور شاہ	۲/۲۵
بے بس	جگدیش بھارتی	۳/-

منگانے کا پتہ

پنجابی پستک بھنڈار، دریبہ کلاں دہلی ۶

کرشن چندر

کی

دیگر تصانیف

ناول

چاندی کا گھاؤ	۵/۵۰
لوفر	۳/-
ایک گدھا نیفا میں	۴/-
درد کی نہر	۴/-
برف کے پھول	۳/-
ایک وائلن سمندر کے کنارے	۶/۵۰
میری یادوں کے چنار	۵/۵۰
گدھے کی واپسی	۳/-
سڑک واپس جاتی ہے	۵/۵۰
شکست	۴/۵۰
دل کی وادیاں سو گئیں	

لال تاج	۲/۷۵
اُلٹا درخت	۲/۲۷
ایک عورت ہزار دیوانے	۳/۵۰

افسانے

دسواں پُل	۴/-
اَن داتا	۲/۷۵
نغمے کی موت	۲/۷۵
ایک روپیہ ایک پھول	۲/۷۵
نئے افسانے	۳/-
یوکلپٹس کی ڈالی	۲/۷۵
کتاب کا کفن	۳/۷۵
آسمان روشن ہے (ناول)	۳/-

منگانے کا پتہ

پنجابی پُستک بھنڈار، دریبہ کلاں، دہلی ۶

چلی گئی۔ لیڈی ہیرڈریسر اور دو خادمائیں اس کے جلو میں تھیں۔
اُسے یوں جاتے دیکھ کر مدن کے ہونٹوں پر فتح یابی کی ایک کامران مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اِس دن کے لئے اُس نے جدّوجہد کی تھی۔ اس دن کے لئے وہ جیا تھا۔ اِس دن کے لئے اُس نے فاقے کئے تھے۔ چنے کھا کر میلی پتلون اور میلی قمیض پہن کر تپتی دوپہریوں، یا موسلا دھار برسات سے بھیگی ہوئی شاموں میں وہ پروڈیوسروں کے دفتروں کے چکّر لگاتا رہا تھا۔ آج اس کی کامیابی کا پہلا دن تھا۔ کامیابی کی پہلی سیڑھی اُسے چمن بھائی نے سجھائی تھی۔ چمن بھائی فلم پروڈیوسروں کو کرائے پر ڈریس سپلائی کرتا تھا۔ اور اکثر اوقات مختلف پروڈیوسروں کے دفتروں یا مختلف اسٹوڈیو میں اُسے مل جاتا تھا۔ ایک دن جب مدن پھٹے حالوں میں اس طرح گھوم رہا تھا، چمن بھائی نے اُسے اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔

"کہیں کام بنا؟"

"نہیں"

"تم نرے گدھے"

اب مدن نے گالی سُن کر بھی خاموش رہ جانا سیکھ لیا تھا۔ اسی لئے وہ خاموش رہا۔

دیر تک چمن بھائی بڑے غصّے میں اُسکی طرف دیکھ کر گھورتا رہا۔ پھر بولا "آج شام کو میں تمہارے گھر آؤں گا اور تمہیں کچھ گر کی باتیں

بتاؤں گا۔"

پریم لتا نے اپنی ساڑھی کے پھٹے ہوئے آنچل سے اپنی جوانی کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اس نے بیزار ہو کر منہ پھیر لیا۔ جہاں جاؤ کوئی نہ کوئی ملک گردھاری لال مل جاتا ہے۔

مگر اس شام چمن بھائی نے اُن کے جھونپڑے میں کاجو پیتے ہوئے کوئی غلط بات نہیں کی۔ البتہ پانچویں پیگ کے بعد چلّا کر بولا۔

"جب تک پریم لتا تمہاری بیوی رہے گی یہ کبھی ہیروئن نہیں بن سکتی۔"

"کیا بکتے ہو؟" مدن غصّے سے چلّا کر بولا۔

"ٹھیک بکتا ہوں۔" چمن بھائی ہاتھ چلا کر زور دار لہجے میں بولا۔ "سالا ہلکٹ! کس کو تمہاری بیوی دیکھنے کی چاہت ہے۔ سب لوگ۔ مِل مجدور سے لے کر مِل مالک تک فلم کی ہیروئن کو کنواری دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"کنواری؟"

"اِکدم وِرجن (VIRGIN)"

"مگر میری بیوی کنواری کیسے ہو سکتی ہے۔؟ وہ تو شادی شدہ ہے۔"

"تو اُس کو شادی والی مت بولو۔ کنواری بولو۔ اپنی بیوی مت بولو۔ بولو، یہ لڑکی میری بہن ہے۔"

"میری بہن؟" مدن نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں — ہاں۔ تمہاری بہن — ارے بابا! کون تمہاری اِس جھونپڑی میں دیکھنے کو آتا ہے کہ یہ تمہاری بہن ہے کہ بیوی ہے —؟ مگر دنیا کو تو بولو کہ یہ تمہاری بہن ہے — پھر دیکھو کیا ہوتا ہے — ؟"

چمن بھائی تو یہ گر بتا کے چلا گیا — مگر پریم لتا نہیں مانی۔ مدن کے بار بار سمجھانے پر بھی نہیں مانی۔

"میں اپنے شوہر کو اپنا سگا بھائی بتاؤں گی ؟ ..... ہرگز نہیں — ہرگز نہیں ہو سکتا — اس سے پہلے میں مر جاؤں گی — تم میری زبان گدی سے باہر کھینچو گے، جب بھی میں اپنے پتی کو اپنا بھائی نہیں کہوں گی۔"

آخر مدن کو پھر اُسے پٹینا پڑا۔ دو دن پریم لتا نے چار چوٹ کی مار کھائی تو سیدھی ہو گئی۔ اور فلم پروڈیوسروں کے دفتروں میں جا کر اپنے شوہر کو اپنا بھائی بتانے لگی۔

چمن بھائی نے مدن کو اپنے ایک دوست پروڈیوسر جھگن بھائی سے ملوا دیا۔ جھگن بھائی نے پریم لتا کے فوٹو ایک کمرشیئل اسٹوڈیو سے نکلوائے۔ اپنے ڈائرکٹر مرزا عزت بیگ کو بلوا کر پریم لتا سے اس کا تعارف کرایا۔ مرزا عزت بیگ نے بڑی گہری نظروں سے پریم لتا کو دیکھا۔ اس سے بات چیت کی۔ پھر اسکرین ٹیسٹ کے لئے ہاں کر دی۔ اسکرین ٹیسٹ کے لئے فلم کا ایک سین پریم لتا کو یاد کرنے کے لئے دیا گیا

اور تین دن کے بعد اسکرین ٹیسٹ رکھا گیا۔ تینوں دن ہر روز شام کے وقت چمن بھائی جھونپڑے میں مدن اور پریم لتا سے ملنے کے لئے آتا رہا اور کاجو پیتا رہا۔ اور اُن دونوں کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔

تیسرے دن چمن بھائی نے مدن سے کہا۔

"آج اسکرین ٹیسٹ ہے۔ میری مانو تو تم آج پریم لتا کے ساتھ نہ جاؤ"

"کیوں نہ جاؤں؟"

"اس لئے کہ اگر تم ساتھ گئے تو پریم لتا فری ایکٹنگ نہ کر سکے گی۔ تمہیں دیکھ کر شرما جائے گی اور گھبرا جائے گی۔ اور اگر پریم لتا گھبرا گئی تو یہ اسکرین ٹیسٹ میں فیل ہو جائے گی"

"کیسے فیل ہو جائے گی؟" مدن شراب کے نشے میں جھلا کر بولا۔ "میری بیوی نسیم، سچترا سین، مدھو بالا سے بھی خوب صورت ہے۔ میری بیوی الزبیتھ ٹیلر سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ میری بیوی نرگس سے بہتر اداکارہ ہے۔ میری بیوی کسی اسکرین ٹیسٹ میں فیل نہیں ہو سکتی۔ میری بیوی....."

"ابے سالے بیوی نہیں بہن بول بہن!" چمن بھائی ہاتھ چلاتے ہوئے زور سے بولا۔

"اچھا بہن ہی سہی" مدن شراب کا جام خالی کرتے ہوئے بولا۔ "جیسا تم بولو گے چمن بھائی ایسا ہی میں کروں گا۔ آج تک کوئی بات

ٹالی ہے جو اب ٹالوں گا ۔ لے جاؤ ۔ میرے بھائی ! اپنی بہن کو تم ہی آج اسکرین ٹیسٹ کے لئے لے جاؤ ۔ مگر حفاظت سے لے آنا "۔

" کھاتری رکھو ۔ اپنی گاڑی میں لے کر جا رہا ہوں ۔ اپنی گاڑی میں لے کر آؤں گا "۔

بہت رات گئے پریم لتا اسکرین ٹیسٹ سے پروڈیوسر کی گاڑی میں لوٹی ۔ اُس نے وہی ساڑھی پہن رکھی تھی جو اسکرین ٹیسٹ کے لئے استعمال کی گئی تھی ۔ اور اس کے مُنہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی ۔

مدن غصّے سے پاگل ہو گیا ۔

" تم نے شراب پی ؟ "

" ہاں سین میں ایسا ہی کرنا تھا "

" مگر پہلے سین میں جو تمہیں دیا گیا تھا اُس میں تو ایسا نہیں تھا "

" مرزا عزّت بیگ نے سین بدل دیا تھا "

" تو تم نے شراب پی ۔ صرف شراب پی ؟ " مدن نے اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا ۔

" ہاں صرف شراب پی "

" اور تو کچھ نہیں ہوا ؟ "

" نہیں " پریم لتا بولی " البتہ سین کی ریہرسل الگ کراتے

ہوئے مرزا عزت بیگ نے میری کمر میں ہات ڈال دیا۔"

"کمر میں ہات ڈال دیا..... کیوں؟" مدن نے ایکدم بھڑک کر کہا۔

"سین کا ایکشن سمجھانے کی خاطر۔" پریم لتا بولی۔

"مدن کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ آہستہ سے بولا "صرف کمر میں ہات ڈالا۔ عزت پر ہات تو نہیں ڈالا؟"

"نہیں۔" پریم لتا نے نظریں چرا کر کہا۔

"صاف صاف بتاؤ۔ کچھ اور تو نہیں ہوا؟"

"ہاں ہوا تھا۔" پریم لتا جھجکتے جھجکتے بولی۔

"کیا ہوا تھا؟" مدن پھر بھڑکنے لگا۔

"اسکرین ٹیسٹ کے دوران میں وہ جو میرے سامنے ہیرو کا کام کر رہا تھا اُس نے مجھے زور سے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔"

"ایسا اس بدمعاش نے کیوں کیا؟" مدن گرج کر بولا۔

"ایسا ہی سین تھا۔" پریم لتا بولی۔

"اچھا، سین ہی ایسا تھا۔" مدن اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے بولا۔ "سین ہی ایسا تھا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ مگر ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ صرف بانہوں میں لے کر بھینچا تھا؟"

"ہاں۔ صرف بانہوں میں لے کر بھینچا تھا۔" پریم لتا گلوگیر لہجے میں بولی — پھر یکایک بستر پر گر کر تکیے میں سر چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگی ۔

"شاٹ تیار ہے"

یہ پروڈیوسر چھگن بھائی کی آواز ہے ۔ مدن اس آواز کو سُن کر چونک گیا اور بے اختیار کرسی سے اُٹھ گیا ۔ چھگن بھائی مدن کو دیکھ کر مسکرایا ۔ ہات بڑھا کر اُس نے مدن سے مصافحہ کیا۔ بڑے پیار سے اس کے کاندھے پر ہات رکھا، اور اس سے پوچھا ۔

"سروج بالا کہاں ہے ؟"

چھگن بھائی نے اپنی نئی ہیروئن کا نام پریم لتا سے بدل کر سروج با رکھ دیا تھا۔ پیشتر اس کے کہ مدن کوئی جواب دے ، نئی ہیروئن خود ڈریسنگ روم سے نکل کر خراماں خراماں میک اپ روم میں چلی آئی ، اور نئے لباس ۔ نئے ہیر اسٹائل اور مکمل میک اپ کے ساتھ ہر قدم پر ایک نیا فتنہ بیدار کرتے ہوئے آئی ۔ چند لمحوں تک تو مدن بالکل مبہوت کھڑا اُسے دیکھتا رہا ۔ گویا اُسے یقین نہ ہو کہ یہ عورت اُس کی بیوی پریم لتا ہے ۔ چھگن بھائی بھی ایک لمحے کے لئے بھونچکا رہ گیا۔ اور اس ایک لمحے میں اُسے مکمل اطمینان ہو گیا کہ اس نے جو فیصلہ کیا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا ۔

دوسرے لمحے میں جھگن بھائی نے تھیٹریکل انداز میں اپنے سینے پر اپنا ہات رکھا اور بلند آواز میں کہنے لگا۔

"شاٹ تیار ہے سرکار والی ۔ سیٹ پر تشریف لے چلئے۔"

نئی ہیروئن کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مدن کو ایسا لگا جیسے کسی شاہی ہال میں لٹکے ہوئے استنبولی فانوس کی بہت سی بلّوریں قلمیں ایک ساتھ بج اُٹھیں۔

نئی ہیروئن گویا مسکراہٹ کے موتی بکھیرتی ہوئی جھگن بھائی کے ساتھ سیٹ پر چلی۔ مدن بھی پیچھے پیچھے چلا۔ اور جھگن بھائی کو اپنی بیوی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر مدن کو وہ دن یاد آیا جب جھگن بھائی نے اسکرین ٹیسٹ کے چند دن بعد مدن کو اپنے دفتر بلا بھیجا تھا۔

جھگن بھائی مدن کی کمر میں ہات ڈال کر خود اُسے اندر کمرے میں لے گیا تھا جو ایر کنڈیشنڈ تھا۔ اور جھگن بھائی کا اپنا ذاتی پرائیویٹ کمرہ تھا جس میں بزنس کے تمام اہم اُمور طے ہوتے تھے۔ جب مدن اس کمرے کے اندر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اُس سے پہلے اس کمرہ میں مرزا عزت بیگ اور چمن بھائی بیٹھے ہوئے ہیں ۔

"آج بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہے۔" چمن بھائی نے ہنسکر کہا۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

سٹار پاکٹ
سیریز: ۱۸۷

کبوتر کے خط

از
کرشن چندر

"آج ہم لوگ ایک سونے کی کان خریدنے جا رہے ہیں۔"

"سونے کی کان؟" مدن نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں اور تمہارا بھی اس میں حصہ ہے۔ ایک چوتھائی کا اور باقی تین تمہارے پارٹنر تمہارے سامنے اس کمرے میں بیٹھے ہیں۔ میں چھگن بھائی یہ میرا دوست چمن بھائی۔ یہ میرا ڈائریکٹر مرزا عزت بیگ۔ ہم چاروں آج سے اس سونے کی کان کے پارٹنر ہوں گے۔"

"اور یہ سونے کی کان ہے کہاں؟"

جواب میں چھگن بھائی نے میز سے ایک تصویر اٹھائی، اور مدن کو دکھاتے ہوئے بولا۔

"یہ رہی۔"

مدن نے حیرت سے کہا۔

"مگر یہ تو میری بیوی..... میرا مطلب ہے میری بہن کی تصویر ہے۔"

"یہی سونے کی نئی کان ہے۔ تمہاری بہن کو اپنی نئی پکچر میں ہیروئن لے رہا ہوں، اور فلم انڈسٹری کے ٹاپ ہیرو کے سنگ۔ دیو راج کے سنگ۔ جس کی کوئی تصویر سلور جبلی سے ادھر اترتی ہی نہیں۔ بولو؟ پھر ایک پکچر کے بعد اس ہیروئن کی قیمت ڈھائی لاکھ ہو گی کہ نہیں؟ اس کو میں سونے کی کان بولتا ہوں تو کیا غلط بولتا ہوں۔؟ جواب دو۔"

"مگر میں پوچھتا ہوں کہ میری سونے کی کان آپ کی کیسے ہوگئی؟" مدن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیوں کہ میں اُسے ہیروئن لے رہا ہوں" چھگن بلند آواز میں بولا نہیں تو یہ لڑکی کیا ہے ۔ گورے گاؤں کے ایک جھونپڑے میں رہنے والی پندرہ روپے کی چھوکری ۔! پھر میں اس کی پبلسٹی پر کچھ ہزار روپیہ خرچ کروں گا کہ نہیں ۔؟ پھر میں اس کو ٹاپ کے ہیرو دیوراج کے سنگ ڈال رہا ہوں ۔ اس کے بعد اگر میں اس کان میں ففٹی پرسنٹ کا شیئر مانگتا ہوں تو کیا زیادہ مانگتا ہوں؟ اور صرف پانچ سال کے لئے ۔!"

"اور تم ؟" مدن نے چمن بھائی سے پوچھا۔

"اگر میں تمہیں چھگن بھائی سے نہ ملاتا تو تمہیں یہ کانٹریکٹ آج کہاں سے ملتا! ۔ اس لئے حساب سے ساڑھے بارہ فیصدی کا کمیشن میرا ہے"

"اور تم ؟" مدن عزت بیگ کی طرف مڑ کر بولا۔

"این تو ڈائریکٹر ہے" مرزا عزت بیگ بولا "این چاہے تو اس پکچر میں نئی ہیروئن کو فرسٹ کلاس بنا دے ۔ چاہے تو تھرڈ کلاس بنا دے ۔ اس لئے این کو بھی ساڑھے بارہ فیصدی چاہیئے"

"مگر یہ تو بلیک میل ہے" یکایک مدن بھڑک کر بولا۔

"عزت کی بات کرو ۔ عزت کی" عزت بیگ خفا ہو کر

بولا ” اپن اپنی عزت ہمیشہ بیگ میں رکھتا ہے ۔ اس لئے اپن کا نام عزت بیگ ہے ۔ اپن عزت چاہتا ہے اور اپنا شیئر ۔ صرف ساڑھے بارہ فیصدی “

یکایک مدن کو ایسا محسوس ہوا جیسے پریم لتا کوئی عورت نہیں ہے وہ ایک کاروباری تجارتی ادارہ ہے جس کے شیئر بمبئی کے اسٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت کے لئے آ گئے ۔ جیسے گلوب کمبائن الکائن اور ٹاٹا ڈیفرڈ۔ ایسے ہی پریم لتا پرائیویٹ لمیٹیڈ ۔ !

” مجھے کہاں دستخط کرنے ہوں گے ؟“ مدن نے تقریباً روہانسا ہو کر پوچھا ۔

فاقوں کے ماہ و سال ماضی کا حصہ بن چکے تھے ۔ جس دن مدن نے کانٹریکٹ پر دستخط کئے ، چھگن نے اُسے دو ہزار کا چیک دیا ۔۔۔ ملبار ہل پر اُن کے رہنے کے لئے ایک عمدہ فلیٹ ٹھیک کر دیا ۔ ایک نئی فیاٹ گلوب موٹرز کی دوکان سے نکلوا کے دے دی ۔ اسی رات مدن اور پریم لتا اپنے نئے فلیٹ میں چلے گئے ، اور مدن نے پریم لتا کو گلے سے لگا کر اس کی کامیابی کے لئے دعا کی اور مدن کے پیروں کو چھو کر پریم لتا نے پرتگیا کی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صرف اس کی بیوی ہو کر رہے گی ۔ آخر کار مدن کی محنت اور جد و جہد رنگ لائی ۔ آخر کار کامیابی نے مدن کے پاؤں چومے ۔ آج اُس کی بیوی ہیروئن تھی ۔ پریم لتا ، سروج بالا تھی اور آج اس کی شوٹنگ کا پہلا دن تھا ۔

اور اب وہ دن بھی ختم ہو رہا تھا۔ اسٹیج نمبر ون کے باہر مدن اپنی فیاٹ میں بیٹھا ہوا بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ کب پانچ بجیں گے کب پیک اپ ہوگا اور کب وہ اپنی دِل کی رانی کو اپنی فیاٹ میں بٹھا کر دور کہیں سمندر کے کنارے ڈرائیو کے لئے لے جائے گا۔

پیک اپ کی گھنٹی بجی ـــــ اور مدن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد نئی ہیروئن باہر نکلی ـــ اس کا ہاتھ ہیرو دیوراج کے ہاتھ میں تھا، اور وہ دونوں بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے، ہنستے بولتے، ہاتھ جھلاتے ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے۔ ساتھ ساتھ فیاٹ سے آگے چلے گئے، جہاں ہیرو کی شاندار امپالا گاڑی کھڑی تھی۔

مدن نے فیاٹ کا پٹ کھول کر آواز دی۔

"سروج"

"ہاں بھیّا ـــ!" ہیروئن پلٹ کر چلائی ـ اور پھر دوڑتی ہوئی مدن کے پاس آئی اور آہستہ سے بولی "تم گھر جاؤ۔ میں دیوراج کی گاڑی میں آتی ہوں"

"مگر تم میری گاڑی میں کیوں نہیں جا سکتیں؟" مدن نے غصّے سے پوچھا۔

"باؤلے ہوئے ہو" پریم لتا نے طیش کھا کر جواب دیا "میں اب

ایک ہیروئن ہوں۔ اور اب میں کیسے تمہارے ساتھ اس چھوٹی سی فیاٹ میں بیٹھ کر اسٹوڈیو سے باہر نکل سکتی ہوں۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

"سروج!" اُدھر سے ہیرو زور سے چلّایا۔

"آئی!" سروج زور سے چلّائی اور پلٹ کر ہیرو کی گاڑی کی طرف دوڑتی ہوئی چلی گئی۔ دیوراج سامنے کی سیٹ پر ڈرائیو کرنے کے لئے بیٹھ گیا اور سروج اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ پھر امپالا کے پٹ بند ہو گئے۔ اور وہ خوب صورت فیروزی گاڑی ایک خوش آئند ہارن کی موسیقی پیدا کرتے ہوئے گیٹ سے باہر چلی گئی اور مدن کی فیاٹ کا پٹ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

✤

جگر گوشے

دس سال سے یعنی جس دن سے میری شادی ہوئی ہے، یہی ایک سوال بار بار کسی نہ کسی صورت میں ہمارے سامنے دُہرایا جاتا ہے:

آپ کے ہاں بچّہ کیوں نہیں ہوتا؟ —

یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ کے ہاں روٹی ہے؟ — گھر ہے؟ — روزگار ہے؟ — خوشی ہے؟ — عقل ہے؟ — سب یہی پوچھتے ہیں کہ آپ کے ہاں بچّہ ہے؟ — گویا بچّہ ان تمام ضروریاتِ زندگی کا نعم البدل مان لیا گیا ہے۔ ہم دونوں کو اِس سوال سے انتہائی کوفت ہوتی ہے مگر کیا کریں سماجی سُکون کی خاطر طرح طرح سے اِس سوال کو ٹالنا پڑتا ہے

میرے ایک دوست ہیں ماشاء اللہ سات عدد بچوں کے باپ ہیں اور آٹھویں کی فکر میں ہیں۔ اُن کے بچے اکثر بیمار رہتے ہیں۔ آج ایک کو کالی کھانسی ہے، تو دوسرے کو بخار ہے۔ تیسرے کو چیچک نکل آئی ہے۔ تو چوتھے نے سڑک پر گر کر اپنا سر پھوڑ لیا ہے۔ پانچویں کی آنکھیں دُکھتی ہیں، تو چھٹا اس بات پر اُدھار کھائے ہوئے ہے کہ کب کسی مہمان کی گود میں بیٹھے، اور پیشاب کرے۔ مگر اس روشن اولاد کے باپ کو صرف ایک ہی غم کھائے جا رہا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے مجھ سے سوال کرتے رہتے ہیں۔

"آپ کے ہاں بچہ کیوں نہیں ہوتا؟"

میں اس سوال کے جواب میں اکثر اپنی ڈبڈبائی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھا کر نہایت مسکین لہجے میں جواب دیتا ہوں۔

"کیا بتاؤں نہیں ہوتا"

گویا اس حادثہ یا عدم حادثہ کی ذمے داری مجھ پر نہیں خدا پر عائد ہوتی ہے۔ مگر میرے دوست کی تسلی اس جواب سے نہیں ہوتی۔ آگے جھک کے بڑے رازدارانہ لہجے میں فرماتے ہیں۔

"کسی ڈاکٹر کی مدد لیجئے"

میں کہتا ہوں۔

"کیسے لے سکتا ہوں۔ جس ڈاکٹر کے ہاں ہم لوگوں کا علاج ہوتا ہے اُس کے ہاں خود کوئی بچہ نہیں ہے"

وہ فوراً گھبرا کر کہتے ہیں "آپ سمجھے نہیں — میرا باپ

ہے ..... کسی ڈاکٹر کو دکھائیے .... ممکن ہے آپ کے اندر کوئی نقص ....."

میں بات کاٹ کر کہتا ہوں۔

"دکھایا ہے۔ کوئی نقص نہیں ہے۔"

"اور ہماری بھابی؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔"

"وہ بھی ٹھیک ہیں ..... آپ بھی ٹھیک ہیں" میرے دوست بڑی حیرت سے کہتے ہیں "پھر بھی بچہ نہیں ہوتا۔ حیرت کی بات ہے صاحب!"

یہ کہہ کر غور سے اور انتہائی شُبہے سے مجھے دیکھنے لگتے ہیں، جیسے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اور کسی خوفناک بلکہ شرمناک مرض کا شکار ہوں اور اُن سے دانستہ چھُپا رہا ہوں۔ اُن کا بس نہیں چلتا۔ ورنہ وہ خود کھڑے کھڑے ہم دونوں کا ڈاکٹری معائنہ کرا ڈالیں۔

ایک اور دوست ہیں ہمارے! اُنہیں یہ تو شُبہہ نہیں ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی میں خدانخواستہ کوئی نقص ہے۔ مگر وہ یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ دیدہ و دانستہ بچّہ پیدا نہیں کرتے۔ وہ جب بھی ہمارے ہاں آتے ہیں۔ بچّوں کے فوائد پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں۔ البتہ تقریر کرتے وقت انداز سیاستداں کا سا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ایسے بروکر کا ہوتا ہے جیسے ہمارے ہاں بچّہ

پیدا ہونے پر ان کو فوراً کمیشن ملے گا۔

میں اُن سے بہت اُلجھتا ہوں۔ کیونکہ مجھے خواہ مخواہ شُبہ ہو جاتا ہے کہ بچّہ میں پیدا کردوں اور فائدہ ان کو ہوگا۔ جی یہی چاہتا ہے کہ محض ان کو زک دینے کے لئے زندگی بھر کوئی بچّہ پیدا نہ کیا جائے۔ اکثر فرماتے رہتے ہیں، اگر آپ کے گھر کوئی بچّہ ہوتا تو ضرور میں اُس کی شادی اپنی مُنّی سے کرتا۔ اُن کی مُنّی انتہائی بدصورت، بھینگی، بدمزاج اور مرگھلی ہے محلّے کے سب بچّوں سے لڑتی رہتی ہے۔ اُس کے سر پر بال اس قدر کم ہیں کہ بڑی ہونے پر انشاء اللہ واقعی گنجی ثابت ہوگی۔ مگر یہ حضرت ہیں کہ میرے گھر میں اسی چاندسی بیوی کا اضافہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اِس مُنّی کو دیکھ کر مجھے نہ صرف اپنے بلکہ اُن تمام بچّوں کی خوش قسمتی پر رشک ہوتا ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ یا جن کے پیدا ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔

ہمارے ایک تایا ہیں۔ پچاسی برس کی عُمر ہونے پر بھی اُن کا نام چُھٹن لال ہی ہے۔ تایا چُھٹن لال بچّوں کے بے حد قائل ہیں اور جوں جوں بوڑھے ہوتے جاتے ہیں۔ بچّوں کے زیادہ سے زیادہ قائل ہوتے جاتے ہیں گھر آتے ہی میرے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہیں۔ مجھ پر کم۔ میری بیوی پر زیادہ۔ پھر ایک آہ سرد بھر کر کہتے ہیں۔

"افسوس تمہارے ہاں کوئی بچّہ نہ ہوا۔ اُسے گود میں کھلانے کا ارمان دل ہی دل میں رہ گیا۔"

میں جواب دیتا ہوں ۔

"تایا جی! مجھے ہی گود میں کھلا لیجئے۔"

تو اس پر برہم ہو جاتے ہیں ۔ کہتے ہیں ۔

"تو نہیں جانتا ۔ تو تو احمق ہے ۔ نرا پورا احمق! بچے تو گھر کی رونق ہوتے ہیں ۔ وہ کبھی جھگڑتے ہیں ۔ کبھی ہنستے ہیں ۔ کبھی روتے ہیں ۔ کبھی چلاتے ہیں ۔ دھول دھپا کرتے ہیں ۔ بچوں کے ہونے سے گھر میں عجیب رونق سی رہتی ہے۔"

میں کہتا ہوں ۔

"اس کام کے لئے ہمسائے کے بچے کیا کافی نہیں ہوتے ۔ ؟ پھر جہاں تک چیخنے چلانے کا تعلق ہے ۔ آدمی بچے کیوں پیدا کرے وہ آل انڈیا ریڈیو کا کوئی ڈرامہ کیوں نہ سن لے ۔ جس میں چیخنے چلانے کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں ۔ اس کے لئے ایک بچے کو نو مہینے پیٹ میں رکھنا ۔ پھر اسے پالنا پوسنا اور اس پر ہزاروں روپے خرچ کرنا کیا ضروری ہے ۔ جب کہ یہ کام بہ آسانی ریڈیو کی ایک سوئی گھمانے سے سرانجام دیا جا سکتا ہے۔"

میری یہ بات سن کر وہ اور برہم ہو جاتے ہیں ۔

"تیری تو مت ماری گئی ہے ۔ اور تو اپنے ساتھ اپنی بیوی کو بھی لے ڈوبے گا۔"

پھر وہ بڑے پیار سے میری بیوی کی طرف مخاطب ہو کر

ناشر: سٹار پبلیکیشنز

۲۷۱۵ دریا گنج دہلی ۶

سول ایجنٹس: پنجابی پستک بھنڈار

دریبہ کلاں دہلی ۶

قیمت ایک روپیہ صرف

مطبع: دلی پرنٹنگ ورکس دہلی

کہتے ہیں ۔

"کیوں بٹیا! تجھے تو بچے پسند ہیں نا ۔؟"

اور میری بیوی لجا کر نہایت شرمیلی آواز میں جواب دیتی ہے ۔

"جی ہاں ۔ بشرطیکہ وہ دوسروں کے ہوں۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہوں اور غسل خانے سے فارغ ہو چکے ہوں ۔"

اس پر تایا جی ہنس پڑتے ہیں۔ اور میری بیوی کے ہات سے دودھ جلیبی کھا کر رخصت ہو جاتے ہیں یہ دعا دیتے ہوئے ۔

"بھگوان تیری کوکھ ہری کرے ۔"

اب یہ کون کس کو سمجھائے کہ جوں جوں کوکھ ہری ہوتی جاتی ہے یہ دُنیا اُجڑتی جاتی ہے ۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان کی آبادی دس کروڑ تھی ۔ اب چالیس کروڑ ہے ۔ اورنگ زیب کے زمانے میں آٹھ آنا روپے کا ڈیڑھ من تھا ۔ اب روپے کا ڈیڑھ سیر بھی مشکل سے ملتا ہے ۔ سائنسدانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر دُنیا کی کوکھ اسی طرح ہری ہوتی رہی تو اگلے تین سو سال کے بعد انسانی آبادی اس قدر بڑھ جائے گی کہ ایک انسان کے حصے میں صرف ایک مربع گز زمین آئے گی ۔

اب اس ایک گز زمین میں آپ چاہے کھڑے ہو لیں ۔ چاہے بیٹھ لیں یا چاہے سو لیں، یا چہل قدمی کر لیں ۔ ایک مربع گز زمین پر آپ اپنا گھر بنا لیجئے اور اسی پر اپنی قبر ۔! اس سے زیادہ زمین آپ کو تین سو سال کے بعد نہیں

ملنے والی ہے۔

اور سائنس دانوں نے یہ بھی اندازہ لگایا ہے کہ جس رفتار سے آجکل بچے پیدا ہو رہے ہیں ۔ اسی شرح کے مطابق اگلے سات سو سال میں انسانوں کی آبادی اتنی بڑھ جائے گی کہ اُن کا کل وزن ملا کے زمین کے وزن سے بڑھ جائے گا۔ لازماً زمین اتنا بوجھ نہیں سہار سکے گی اور ٹکڑے ہو جائے گی ۔ یعنی قیامت آجائے گی۔

گو جو بچے پیدا کرتا ہے، وہ دھیرے دھیرے قیامت کو قریب لاتا ہے۔ مگر ہندوستان میں یہ بات آپ کسی سے نہیں کہہ سکتے۔ کسی کی کوکھ ہری ہو یا نہ ہو، آپ کی چُندیا ضرور ہری کر دی جائے گی۔

اس لئے بچوں کے سلسلے میں مجھے تو آج تک اپنا ہم خیال کوئی نہیں ملا۔ لیکن ایک بار میری بیوی کو ایسی سہیلی مل گئی تھی۔ قصّہ یہ ہوا کہ میری بیوی ایک روز اکیلے سینما دیکھنے چلی گئی۔ کوئی ہندوستانی پکچر تھی۔ اُس تصویر میں ٹن ٹن کے بارہ بچے ۔ پورے بارہ بچے تلے اوپر کے دکھائے گئے تھے۔ بارہ بچوں کی لین ڈوری کو دیکھ کر میری بیوی تو ہنس ہی پڑی ـــــ لیکن ساتھ کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ایک عورت بھی ہنس پڑی۔

میری بیوی کو یہ دیکھ کر پہلے تو بڑی حیرت ہوئی۔ بعد میں اُس نے اُس عورت سے بہنا پا کر لیا۔ بعد میں میری بیوی کو پتہ چلا کہ وہ عورت محض اس لئے ہنسی تھی کہ اس کے صرف گیارہ بچے تھے ۔ ! گیارہ بچوں والی عورت

کو بارہ بچّوں والی عورت پر ہنسنے کا پورا پورا حق ہے۔

یہ اکثر کہا گیا ہے کہ بچّے قوم کی دولت ہیں ۔ اگر یہ سچ ہے تو ہندوستان کا شمار دُنیا کی امیر ترین قوموں میں کرنا چاہیئے ۔ زندگی کے کسی اور شُعبے میں ہم دَولت پیدا کریں یا نہ کریں، بچّے پیدا کرنے میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ۔

ہمارے محلّے میں ایک صاحب رہتے ہیں ـــــ نام اُن کا دولت رام ہے۔ اور واقعی بچّوں کی دولت کے اعتبار سے وہ ہمارے محلّے کے رئیس سمجھے جا سکتے ہیں ۔ اب تک دس بچّے تصنیف فرما چکے ہیں جب اُن کے ہاں پہلا بچّہ ہوا تو اُن کے گھر میں موٹر گاڑی تھی، ریفریجیٹر تھا ریڈیو گرام تھا، غالیچہ تھا۔ صوفہ تھا۔ بجلی کا پنکھا تھا ۔ غرضیکہ آرام و آسائش کی ہر چیز مہیّا تھی۔ پھر جب دوسرا بچّہ پیدا ہوا تو موٹر گئی۔ تیسرے بچّے کے ہونے پر ریڈیو گرام گیا۔ چوتھے پر ریفریجیٹر۔ پانچویں پر غالیچہ۔ چھٹے پر صوفہ ۔ ساتویں پر پنکھا۔ اب دسویں بچّے کی پیدائش پر چند ہفتے ہوئے اُن کے گھر کی بجلی بھی کٹ گئی ہے۔ یعنی جس منزل اور مقام پر کل ہندوستان اورنگ زیب کے زمانے سے اب تک ڈھائی سو سال میں پہنچا ہے ۔ وہ انہوں نے دس سال میں حاصل کر لیا ہے۔ اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں نظر آتے ہیں ۔

اکثر ایک بچّے کو کندھے پر چڑھائے۔ دوسرے کو گود میں اُٹھائے تیسرے کو اُنگلی سے لگائے میرے پاس آتے ہیں۔ اور چوتھے بچّے کو میری گود

میں دے کر کہتے۔

" بھائی صاحب! اب آپ بھی بال بچوں والے ہوتے تو اپنے بچّے کو گود میں لے کر خوش ہوتے۔"

اور میں جلدی سے اُن کے بچّے کو گود سے اُتار کر کہتا ہوں۔

" رہنے دیجئے بھائی صاحب! میں لنڈورا ہی بھلا۔"

اس پر اُن کا بچّہ میری گود سے اُترنے سے انکار کر دیتا۔ اور اپنی ناک سے اُنگلی نکال کر میرے مُنہ میں ٹھونستے ہوئے کہتا ہے۔

" آہا ——— میرا چاچا لنڈولا .... میرا چاچا لنڈولا ..."

پھر ان بچّوں کے نام کس قدر عجیب و غریب ہوتے ہیں ——— جو لڑکا ہے وہ گُڈّو ہے۔ یا بجّو ہے۔ یا پکّو ہے۔ یا سلّو ہے۔ یا جُھنّو ہے۔ وہ راکی ہے، کراکی ہے۔ راتی ہے۔ پاتی ہے۔ پیپڑ فنانی ہے ——— جو لڑکی ہے وہ گیلگی ہے۔ گوگی ہے۔ شُنّی ہے۔ ڈُنّی ہے۔ چمّی ہے۔ پمّی ہے۔ اُلّی ہے۔ بلّی ہے۔ مرگھلّی ہے ——— آج تک آپ نے کسی بچّے کا نام قاعدے اور ڈھنگ کا نہیں سُنا ہو گا۔ اس بات سے جہاں والدین کے ذہن کی غربت پر روشنی پڑتی ہے، وہاں ان بچّوں کے مستقبل کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے جو یہ نام لے کر زندگی کے سفر پر نکلتے ہیں۔ اس حساب سے اپنے بچپن میں پنڈت جواہر لال کا نام ضرور ججّو رہا ہو گا۔ میکملن کا مکّی اور کینیڈی اگر ہندوستان میں پیدا ہوتے تو ضرور ان کا نام کِڈّا ہوتا۔ میرے خیال میں بڑے آدمیوں کی عظمت کا ایک ثبوت

یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بچپن کے مضحکہ خیز ناموں کے باوجود بڑے آدمی بنجاتے ہیں۔ اور جو عام صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں، جیسے کہ اکثر لوگ ہوتے ہیں وہ اِسی مضحکہ خیزی کی بدولت ایک مضحک انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔

بات اگر ناموں تک ہی محدود ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ اچھے بھلے لوگ ایسے لوگ بھی جن کی انشاپردازی، ادب، صحافت اور خطابت کی ساری دُنیا میں دھوم ہے۔ اپنے بچوّں سے اکثر اسی لہجے میں مخاطب ہوتے ہیں ۔ تو بڑا ڈدلو ہے ۔ پپلو ہے ۔ چپلا گھپلو ہے۔ میرا منّا تو آکا باکا ہے ۔ کچوپاکا ہے ۔ چمن پٹا کا ہے ۔ ارے تو ہپّا کھائے گا۔ رپّا کھائے گا؟ ۔ گپّا کھائے گا؟ ۔ دھپّا کھائے گا؟ ۔

یہ کیا زبان ہوتی ہے؟ یہ نہ اُردو ہے نہ ہندی ۔ گجراتی ہے نہ مراٹھی ۔ پشتو ہے نہ بلوچی ۔ انگریزی ہے نہ لاطینی ۔ یہ تو سپرانٹو تک نہیں ہے۔ خدا جانے کس دیس اور قوم کی زبان ہے ۔؟ مگر ہر دیس یا قوم کا فرد اپنے بچے سے اس زبان میں گفتگو کرے گا۔ اور بچے بھی ایسے نامعقول ہوتے ہیں کہ غوں غاں کرتے ہوئے ۔ باہیں اچھال کر، ٹانگیں اٹھا کر، مُنہ پر جھاگ کے بلبلے چھوڑتے ہوئے ہنس ہنس کر سر ہلاتے ہوئے اِسی زبان میں جواب تصنیف فرمانے کی کوشش فرماتے ہیں۔

غالباً دُنیا کی یہی وہ واحد زبان ہے جس کیلئے ڈکشنری کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ ڈکشنری کیا اس کے لئے تو کسی کتاب، کسی گرامر اور کسی

قاعدے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ۔ یہی زبان سیکھ کر جب بچّے بڑے ہو جاتے ہیں ۔ اور زندگی کے مسائل سے الجھ کر اپنا مافی الضمیر بھی ٹھیک طرح سے بیان نہیں کر سکتے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ یہی بچے جب بڑے ہو کر کتابوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور بار بار سینما دیکھنے پر اصرار کرتے ہیں تو انہیں قابلِ ملامت کیوں سمجھا جائے ۔ سارا قصور اُن کے والدین کا ہے ۔ جو اُن کی تربیت ہی اسی انداز میں کرتے ہیں ۔

تربیت سے یاد آیا کہ بالعموم بچّوں کی تربیت ایک سرے سے ہوتی ہی نہیں ۔ آج کل یہ ایک طرح کا فیشن چل نکلا ہے کہ بچّوں کو روکو نہ ٹوکو ۔ جو اُن کا جی چاہے وہی کرنے دو ۔ سُنا ہے اس سے بچّوں کی بہت سی نفسیاتی الجھنیں دور ہو جاتی ہیں ۔ یعنی وہ اُلجھنیں جو بڑے ہونے پر اُن کو لاحق ہو سکتی تھیں ۔ یہ بھی سُنا ہے کہ ایسی نفسیاتی ایجاد کا سہرا فرائیڈ کے سر ہے جس سے بڑا الجھنوں کا بانی اور گورکھ دھندے باز اس دُنیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا ۔

میرے عزیز دوست دولت رام فرائیڈ کے اس مقولے پر بڑی پابندی سے عمل کرتے ہیں ۔ نہ صرف عمل کرتے ہیں بلکہ بچّوں کو بے راہ روی پر اُکساتے ہیں ۔ یعنی فرائیڈ سے بھی دو ہاتھ آگے جاتے ہیں ۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ۔ یہ حضرت مع اپنی بیوی کے اور چھ بچّوں کے ہمارے گھر میں اُس وقت وارد ہوئے ۔ جب ہم میاں بیوی نہا دھو کر اُجلے کپڑے پہن کر سینما جانے کی تیاری کر رہے تھے ۔ ہمارے ہندوستانی

سماج کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ آپ کتنے ہی ضروری کام یا ضروری تفریح کے لئے جا رہے ہوں ۔ گھر میں اگر مہمان آجائے تو آپ کہیں نہیں جا سکتے ۔ مہمان سے کچھ کہہ نہیں سکتے ۔ آپ کو لامحالہ رُکنا پڑے گا۔ گھنٹوں بات چیت کرنا پڑے گی ۔ اور باتوں کے دوران میں بات بے بات بلا وجہ یوں ہی ہنسنا پڑے گا ۔ الغرض آپ کو یوں کہنا پڑے گا کہ آپ اپنے ہمسائے کی آمد سے بے حد خوش ہوئے ہیں ۔ حالانکہ اندر ہی اندر آپ کا دل انہیں قتل کرنے کو چاہتا ہوگا ۔ مگر تہذیب مانع ہے ۔ آپ مسکرا کر اور خون کا گھونٹ پی کر (ہمسائے کا نہیں ۔ اپنا) خیر مقدم کرنے پر مجبور ہیں ۔

مگر ہمسائے کے لئے تو کسی خیر مقدم کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی ۔ آپ کو ہو تو ہو ۔ ہمسائے کو نہیں ہوتی ۔ چنانچہ دولت رام نے آتے ہی میری پیٹھ پر ایک زور کا دھپ دیا ۔ اور میری کمر میں ہات ڈال کر بڑی بے تکلفی سے میری ہڈی پسلی ایک کرتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے ۔ مسز دولت رام نے میری بیوی سے باتیں شروع کر دیں، اور بچوں نے غالیچے پر کھڑے ہو کر چاروں طرف کمرے کے سامان کا یوں جائزہ لینا شروع کر دیا، جیسے وہ کسی کمرے میں نہیں کسی جنگل میں آنکلے ہوں ۔

اُس کے بعد دو بچوں نے ٹارزن کی طرح ایک خوفناک چیخ اپنے حلق سے نکالی اور ریڈیو گرام کی طرف لپکے ۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

مگر بچّوں کو کسی کے دل کے دورے سے کیا غرض۔ چنانچہ ایک بچّے نے بڑھ کے ریکارڈ بجانے شروع کر دیئے۔ دوسرے نے ریڈیو کی سوئی گھمانی شروع کر دی۔

تیسرا بچہ بک شیلف پر چڑھ گیا اور کتابیں نکال نکال کر باہر پھینکنے لگا۔ چوتھا بچّہ اونچے کارنر پیس پر پڑے ہوئے گلدان کے پھولوں کو لالچی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر ایک اسٹول اٹھا کر کارنر پیس پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"کیا حال ہے؟" دولت رام نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے میری پیٹھ پر دوسرا دھپ مارا۔

"اچھا ہوں" میں نے کانپ کر مری ہوئی آواز میں کہا۔

اتنے میں ایک زور کا تڑاخہ ہوا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا۔ چوتھے بچّے نے گلدان سے پھول گھسیٹنے کی کوشش میں گلدان ہی کو گھسیٹ لیا تھا۔ اور اب پھولدان فرش پر گر کر ایک سو ایک ٹکڑوں میں بکھرا پڑا تھا۔

"یہی وہ گلدان ہے نا جو آپ خُرجے سے لائے تھے؟" مسٹر دولت رام نے بڑے اطمینان سے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں وہ تو پچھلے ہفتے ہی ٹوٹ چکا تھا" میں نے خوش ہو کر کہا "جب آپ اپنے سب سے چھوٹے بچّے کی سالگرہ کی دعوت کے سلسلے میں تشریف لائے تھے"

"ارے وہ تو دوسرا گلدان تھا" مسز دولت رام نے تصحیح کرتے ہوئے کہا "جسے ہمارے پپو نے توڑا تھا"

پھر وہ میری بیوی کی طرف مخاطب ہو کر بولیں۔

"یہ (اپنے شوہر کی طرف اشارہ کر کے) بڑے بھلکڑ ہو گئے ہیں! انہیں کچھ یاد ہی نہیں رہتا .... کون گلدان کب ٹوٹا تھا .... کون کب؟"

میری بیوی جواب میں کچھ خوفزدہ سی ہو کر منمنائی۔ اتنے میں ریڈیو گرام سے ایک بھیانک سی چیخ بلند ہوئی۔ اور میں نے دیکھا کہ دونوں لڑکے آپس میں لڑ رہے ہیں اور ریڈیو کے دونوں بٹن ریڈیو سے نکل کر ان کے ہاتھوں میں آ چکے ہیں۔ بڑے لڑکے نے چھوٹے لڑکے کے گھونسہ مارا۔

"شاباش!" دولت رام خوشی سے چلّایا۔

مگر گھونسہ لڑکے پر پڑنے کے بجائے ریڈیو گرام کے کانچ پر پڑا۔ اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور لڑکا سہم کر ریڈیو گرام سے الگ کھڑا ہو کر بسورنے لگا۔

"ڈر گیا میرا لال" مسز دولت رام جلدی سے اپنے بچے کو اپنے گھٹنوں پر لیتے ہوئے بولیں۔

اتنے میں میں نے کیا دیکھا کہ تین بچے کتابوں پر جھکے ہوئے ہیں اور مصوّر کتابوں سے تصویریں پھاڑ پھاڑ کر الگ کر رہے ہیں۔ بچّوں کو مطالعے

کا کس قدر شوق ہوتا ہے۔ یہ بات آج ہی سمجھ میں آئی ـــــ اتنے میں دیوان غالب کے مصوّر ایڈیشن پر دو بچوں کا جھگڑا ہو گیا۔ دونوں بچے اس کتاب کو اپنی اپنی طرف کھینچنے لگے۔ کھینچنے میں آدھی کتاب ایک بچے کے ہاتھ میں چلی گئی۔ آدھی دوسرے بچے کے ہاتھ میں رہ گئی۔ اور غالب زبانِ حال سے کہتا رہ گیا۔

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے تماشہ روز و شب مرے آگے

پانچواں اور چھٹا بچہ دونوں بڑے ہوشیار تھے۔ انہوں نے ڈرائنگ روم کو چھوڑ دیا تھا۔ اور درّاتے ہوئے کھانے کے کمرے میں گھس گئے تھے۔ اور وہاں سے سنگترے اور سیب اور تربوز کی قاشیں اٹھا لائے تھے۔ کچھ کھا رہے تھے۔ کچھ مار رہے تھے۔ ایک سیب میرے ماتھے سے جا لگا، اور وہاں سے اچھل کر دیوار پر لگنے والا تھا کہ دولت رام نے قہقہہ مار کر بیچ ہی سے کیچ کر لیا۔ اور میری طرف فاتحانہ انداز سے دیکھ کر بولے۔

"اب تو عادت چھوٹ گئی۔ لیکن بچپن میں کیا کرکٹ کا بہت عمدہ کھلاڑی تھا۔"

اس پر میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے اپنی بیوی کا رنگ متغیر ہوتے دیکھا۔ اور پھر دیکھا کہ چھٹے بچے کی نگاہیں میری بیوی کی نئی شفان کی جوگیا ساڑی پر ہیں۔ بالکل نئی اور خوب صورت ساڑی

ترتیب

پہلا دن	۷
جگر گوشے	۲۷
کھانسی	۴۵
بَینگ بینگ فیٹنگ	۵۷
لوکی	۷۵
کبوتر کے خط	۹۱

تھی ۔ جو جگہ جگہ زردوزی کے کام سے جھلمل جھلمل کر رہی تھی ۔ غریب بچے کا دل اُس ساڑی کو دیکھ کر مچل گیا ۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جو تربوز کی قاشوں میں گھنگھولے ہوئے تھے، اوپر اُٹھائے اور اپنی بہتی ہوئی ناک کو تربوز کی قاش پر صاف کرتے ہوئے جھجکتے جھجکتے آگے بڑھا ۔

"ناں ۔ ناں ۔" میری بیوی خوف سے چلّائی ۔

مسز دولت رام قہقہہ مار کر، تالی بجا کر بولیں ۔

"میرا مُنّن آنٹی کو پکڑے گا ۔ آنٹی کو ضرور پکڑے گا ۔ آنٹی بڑی اچھی آنٹی ہے ڈرنا نہیں ۔"

ماں کی شہ پر مُنّن میاں ذرا دلیری سے آگے بڑھے ۔

میری بیوی گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ اب سب بچّوں نے خوش ہو کر تالی بجائی اور سب اپنے اپنے کھیل چھوڑ کر اس نئے کھیل کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ جوں جوں میری بیوی اپنی نئی ساڑھی بچانے کے لئے پیچھے ہٹتی جاتی تھی ۔ مُنّن میاں آگے آتے جاتے تھے ۔ آخر زور کا ایک جھپٹا مار کر مُنّن نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میری بیوی کی ساڑھی پکڑ لی اور اپنا مُنہ اُس میں چھپا لیا ۔ اور تربوز کا گودا، اور سنگترے کی کھائی پھانکیں اور ناک اور گلے کا لُعاب اُس بے داغ ساڑھی کو جگہ جگہ سے منقش کرتا گیا ۔

میری بیوی چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی ۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اُسے

ہوش آیا تو اس نے مجھے اپنے آپ پر جھکا ہوا پایا۔ مجھ سے نظریں ہٹا کر اُس نے جو کمرے کا جائزہ لیا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کمرے میں کوئی چیز صحیح و سلامت نہیں رہ گئی تھی۔ کتابیں، پھولدان، ریڈیو گرام، میز، تپائیاں، کرسیاں عجیب بے ترتیبی کی حالت میں اس طرح پڑی تھیں جیسے اس گھر پر ابھی ابھی نشہ بندی پولیس نے چھاپا مارا ہو۔

میری بیوی کے لب بڑی سختی سے اندر ہی اندر کو کھنچ گئے۔ اُس نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے مجھ سے گلوگیر لہجے میں لیکن مضبوط اور پختہ ارادے والے لہجے میں مجھ سے کہا۔

"مجھے بچّہ چاہیئے، ضرور چاہیئے۔ بچہ۔ ہوگا۔ ضرور ہوگا"

اس واقعے کے ٹھیک نو ماہ بعد ہمارے گھر میں بچّہ پیدا ہوا، جیسے ہم محض

کھانسی

(ایک انشائیہ)

یوں تو علمِ طب میں کھانسی کی ہزاروں قسمیں بیان کی گئی ہیں لیکن فی زمانہ کھانسی کی دو قسمیں بہت مشہور ہیں۔

ایک ہوتی ہے آٹومیٹک۔

دوسری ہوتی ہے ڈپلومیٹک۔

آٹومیٹک کھانسی خود بخود آتی ہے اور آتی ہی چلی جاتی ہے۔ اس کا کوئی تعلق کسی بیماری یا سماجی ضرورت سے نہیں ہوتا ہے۔ یہ حلق کی ایک جبلّی اور اضطراری حرکت ہوتی ہے جو کھانسنے والے کے گلے سے خود بخود ادا ہوتی رہتی ہے۔

مثال کے طور پر ہماری مارکیٹ میں ایک سبزی فروش ہیں۔ وہ سبزی بیچتے جاتے ہیں اور مسلسل کھانستے جاتے ہیں۔ یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سبزی زیادہ بیچتے ہیں یا کھانسی ؟ ۔ مگر ان کے ہاں کی سبزی اس قدر ہری اور موٹی تازی ہوتی ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ کہیں وہ کھانسی کو بطور کھاد کے تو استعمال نہیں کرتے ہیں ؟ ۔ نتیجے میں ان کی سبزی سب سے پہلے بک جاتی ہے اور آخر میں صرف کھانسی رہ جاتی ہے۔ جسے وہ غالباً پھر اگلے روز کے استعمال کے لئے اٹھا رکھتے ہیں ؟ ۔

اسی مارکیٹ میں ایک مچھلی والے بھی آٹومیٹک کھانسی کے دلدادہ ہیں۔ مگر وہ کچھ اس طرح ہولے ہولے کھانستے ہیں اور زیر لب بڑبڑاتے ہیں کہ ان کی زبان سے مچھلی کی قسم، اس کے بھاؤ، اس کی تازگی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ گاہک اٹکل سے سمجھ جاتے ہیں، اٹکل سے بھاؤ طے کر لیتے ہیں۔ اور اللہ توکلی مچھلی لے جاتے ہیں۔ مچھلی والے صاحب بھی اقرار کرتے ہیں نہ انکار۔ جو گاہک دیتا ہے، لے لیتے ہیں۔ نتیجے میں ان کی ساری مچھلی گلی، سڑی، اور باسی سب بک جاتی ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حضرت خود نہیں کھانستے ہیں، ان کی مچھلیاں کھانستی ہیں ممکن ہے لوگ اسی وجہ سے انہیں عجوبہ سمجھ کر لے جاتے ہوں۔ بہرحال انکی دوکان بھی خوب چلتی ہے۔

ان دونوں حضرات کی دیکھا دیکھی دوسرے دوکانداروں نے

بھی مارکیٹ میں کھانسنے کی کوشش شروع کی۔ مگر کامیاب نہیں ہوئے کھلا جوبات ۔ آمد ۔ میں ہوتی ہے وہ ۔ آورد ۔ سے کیسے پیدا ہوسکتی ہے ۔ ایک صاحب کو تو کھانستے کھانستے گلے کا کینسر ہوگیا ۔ دوسرے جو سبزی فروش تھے انہوں نے کھانستے کھانستے گاہک کے خریدے ہوئے کریلوں پر بلغم تھوک دیا ۔ بس اب آپ خود ہی سوچئے ، ایک تو کڑوا کریلا ، دوسرے بلغم میں سنا !۔ دوسرے ہی مہینے میں دیوالہ پٹ گیا ۔ اب گھر پر پڑے پڑے حقہ پیتے ہیں اور کھانستے ہیں ۔۔۔ وہ آسکر وائیلڈ نے کیا خوب کہا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں بے ایمانی چلتی ہے ۔ اگر نہیں چلتی ہے تو کھانسی میں ۔! (غالباً کھانس کر کہا ہے۔)

کھانسی برائے کھانسی کے قائل میرے ایک دوست سدھا رام بھی ہیں ۔ آپ کی آنکھیں اُداس ، چہرہ لمبوترا ، لہجہ سوز خوانوں کا سا اور کھانسی بکری کی منمناہٹ سے مُشابہ ہے ۔ انہیں دیکھ کر فوراً کسی خوفناک مرض یا موت کا خیال آتا ہے ۔ غالباً اسی لئے یہ انشورنس ایجنٹ ہیں اور اپنے فن میں کامیاب ہیں ۔

سدھا رام گفتگو کے دوران میں مسلسل کھانستے چلے جاتے ہیں اور کھانسی اور گفتگو کو ملا کے کچھ ایسا ملغوبہ تیار کرتے ہیں جس کی ہیئت کچھ اس قسم کی ہوتی ہے ۔

" بھائی صاحب ! اب آپ کھِم کھِے ایک نئی پالیسی لے لو ، ڈی

اٹر بل الف کھٹ کھٹ نئی پالیسی آئی ہے۔ اس کے فائدے کھٹ کھٹ بے شمار کھٹ کھٹ ہیں۔ ایک تو پریمیئم کھٹ کھٹ بہت کم دوسرے بچوں کی کھٹ کھٹ مفت۔ یعنی تعلیم بالکل مفت۔ پھر بیوی کی طویل کھٹ کھٹ یعنی بیماری کا علاج مفت۔ پھر اگر آپ خدانہ نخواستہ مرجائیں کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ تو کفن دفن کا انتظام مفت، اور بیوی کی دوسری شادی ہونے تک کھٹ کھٹ بال بچوں کا خرچہ مفت ۔ بس آپ جلدی کیجئے سے اور کھٹ کھٹ .... ؟

ایسے انشورینس ایجنٹ کو کون ٹال سکتا ہے۔ جلدی سے پالیسی نامہ بھر کے واپس بھیجنا پڑتا ہے۔ ورنہ اس کے کھٹ کھٹ سے سارے محلے کو ہیضہ ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

آٹومیٹک کھانسی کے بالکل اُلٹ ڈپلومیٹک کھانسی ہے ۔ یہ بڑی ہی مہذب اور تربیت یافتہ کھانسی ہوتی ہے۔ یہ بڑی اونچی نسل کی ہوتی ہے۔ اس لئے اُسے بالعموم غیر ملکی سفیر استعمال کرتے ہیں اور بڑے کرٹے موقع کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ سُنا ہے ایک دفعہ چیمبر لین سے ہٹلر نے پوچھا۔

" کیوں صاحب ۔ اگر میں چیکو سلواکیہ پر حملہ کر دوں تو آپ کیا کریں گے ؟ "

جواب میں چیمبرلین کھانس دیئے ۔ حالانکہ وہ اپنا چھاتا کھول سکتے تھے۔

ایک دفعہ نادر شاہ نے محمد شاہ رنگیلے سے پوچھا۔
"اگر میں دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں تو آپ کیا کریں گے؟"
جواب میں محمد شاہ رنگیلے کھانس دیئے۔ حالانکہ رو بھی سکتے تھے
ایک دفعہ جارج واشنگٹن سے پوچھا گیا
"اگر امریکہ کے اصلی باشندے سفید فام حملہ آوروں کے ہاتھوں تہ تیغ نہ ہوتے تو آج امریکہ کا صدر کون ہوتا؟"
جواب میں جارج واشنگٹن صرف کھانس دیئے۔ صرف یہی ایک ایسا موقع اُن کی زندگی میں آیا تھا جب وہ سچ نہیں بول سکتے تھے اور صرف کھانسنے پر مجبور تھے۔

آج بھی بڑے بڑے سربرآوردہ سیاست دانوں کی طرف سے بہت سے تاریخی مسائل کا حل اسی طرح پیش کیا جاتا ہے۔ ایٹمی جنگ بند کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ — کھانسی!۔
مسئلہ کشمیر کا حل کیا ہے؟ — کھانسی!۔
قومی یک جہتی کا راستہ کیا ہے؟ — کھانسی!۔
عوام کی غریبی کا علاج کیا ہے؟ — کھانسی!۔
اور کھانسی کا علاج کیا ہے؟ — یہ اگر کسی ڈپلومیٹ سے پوچھئے تو بغلیں جھانکنے لگے گا۔ کیونکہ ڈپلومیسی کا واحد مقصد بات کو ٹالنا ہوتا ہے۔ کسی مسئلے کا حل پیش کرنا نہیں ہوتا۔
مگر عام لوگوں میں کھانسی ایک سیاسی علامت کے طور پر استعمال

نہیں ہوتی بلکہ بالعموم وہ کسی جسمانی عارضے کی علامت کے طور پر کہی اور سمجھی جاتی ہے۔ اگر آپ کسی ایسی بلڈنگ میں رہتے ہیں جس میں پچاس فلیٹ ہوں اور دیواریں صرف ڈیڑھ اینٹ کی ہوں تو آپ کو میرا مطلب بخوبی سمجھ میں آئے گا۔

بدقسمتی سے میں ایک ایسی ہی بلڈنگ میں رہتا ہوں۔ صبح سویرے ہی مُرغ کی اذان یا کسی بچے کے رونے کی آواز پر بلڈنگ کے مختلف حصّوں سے مختلف کھانسیوں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ ایک صاحب ہیں وہ اس طرح کھانستے ہیں گویا انہوں نے ایک ساتھ ایک درجن مینڈک نگل لئے ہوں۔ دوسرے صاحب نے شاید اپنے حلق میں آٹا پیسنے کی چکی لگوا رکھی ہے۔ ایک صاحب نے شاید اپنے گلے میں موٹر کا ہارن فٹ کر رکھا ہے۔ ایسے بلند و بانگ لہجے میں کھانستے ہیں۔ ایک صاحب ہیں وہ جب ہنستے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کھانس رہے ہیں۔ کھانستے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ہنس رہے ہیں۔ آج تک یہی معلوم نہ ہو سکا کب کھانستے ہیں کب ہنستے ہیں۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ حلق میں کوئی مچھلی پھنسی ہوئی ہے۔ ایک صاحب ہر روز علی الصبح کھانستے ہوئے بلڈنگ سے چہل قدمی کرنے کے لئے یوں نکلتے ہیں گویا کوئی ٹرین پلیٹ فارم سے چھوٹی جا رہی ہے۔

ایک صاحبہ ہیں وہ کچھ اس طرح شرما اور لجا کر کھانستی ہیں گویا کسی بچے کو دودھ پلا رہی ہیں۔

کرمین کی بڑھیا ساس یوں کھانستی ہیں جیسے اپنی بہو کا گلا دبا رہی

ہوں ۔ رام بھروسے ہمیشہ پکّے راگ میں کھانستے ہیں ۔ کیا مجال جو ایک سُر ادھر سے اُدھر ہو جائے ۔ وہی سُر، وہی تال، وہی بھاؤ ۔ بخلاف اِس کے فلیٹ نمبر چھ کے بابو جب کھانستے ہیں تو اُن کے حلق سے بیک وقت چھ سات سُر اکٹھے نکلتے ہیں ۔ سمفنی کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں ۔

الغرض بلڈنگ میں جتنے آدمی ہیں اتنی ہی کھانسیاں ۔ کبھی کبھی یہ بھی سچ معلوم ہوتا ہے کہ جتنے امراض ہیں اتنی ہی کھانسیاں بھی ہوتی ہیں ۔ میں تو اب محض کسی کے کھانسنے ہی سے معلوم کر سکتا ہوں کہ اس شخص کو نزلہ ہے یا ورم میں مبتلا ہے ۔ اس کے پھیپھڑوں میں کوئی تکلیف ہے یا ناک کی ہڈی بڑھ گئی ہے ۔ اسے فلو ہے یا نمونیہ ۔ ٹائی فائیڈ ہے یا خسرہ ۔ یہ دق کی کھانسی ہے یا محض دِق کرنے کی ۔ یہ حقہ پینے والی کی کھانسی ہے یا سگریٹ پینے والے کی ۔ حقہ پینے والے کی کھانسی سگریٹ پینے والے کی کھانسی سے ہمیشہ مختلف ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیئے ۔ آخر ایک ہی اسٹائل میں کھانسے جانا بوریت پیدا کرتا ہے ۔ یہ کہاں کی شرافت ہے ۔ اسلئے تو حقہ پینے والے ہمیشہ اپنی کھانسی میں موضوع کی اہمیت پر زور دیتے ہیں جو اکثر کثیف بلغم کی صورت میں نمودار ہوتی ہے ۔ اور سگریٹ پینے والے فارغ یعنی آزاد شاعری کے دلدادہ نظر آتے ہیں ۔ یعنی پوری پڑھ جاؤ مگر نتیجہ صفر ۔ حلق سے کچھ برآمد ہی نہیں ہوتا ۔

اکثر اوقات مختلف سگریٹ پینے والوں کی کھانسی سن کر آپ کو

ان کے برانڈ کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ ریڈ لیمپ کھانسی ہے۔ یہ قینچی مارکہ ــــ یہ ہنومان بیڑی ہے۔ تو یہ تھری اسٹار ہے۔ یہ ۵۵۵ تو یہ چار سو بیس۔

جس طرح کھانسی کا ایک مزاج اور اسٹائیل ہوتا ہے۔ اسی طرح کھانسی کا ایک رنگ بھی ہوتا ہے۔ کالی کھانسی کا نام تو آپ نے سُنا ہوگا ظاہر ہے کہ اگر کھانسی کالی ہوتی ہے تو کہیں نہ کہیں پر وہ گوری بھی ہوتی ہے۔

کالی کھانسی بہت ہی خطرناک مرض ہے اور جب سے افریقہ آزاد ہو رہا ہے کالی کھانسی بہت سی گوری قوموں کو ہو رہی ہے۔ بالخصوص بہت سی مغربی قوموں کو جنہیں افریقہ کی آزادی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس لئے ادھر گھانا آزاد ہوا۔ اُدھر انہیں کالی کھانسی ہو گئی۔ ساتھ ساتھ میں سوئیز بھی ہوا۔ کانگو آزاد ہونے لگا تو گوروں کو کھانسی ہو گئی اور کالوں کو پھانسی ہو گئی (یاد کرو لومبا) الجیریا، یوگنڈا، کینیا ایک ایک کر کے افریقہ کے ملک ہات سے نکلتے جا رہے ہیں اور مغرب کی گوری قوموں کو کالی کھانسی ہوتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ کالی کھانسی بالعموم بچّوں کو ہوتی ہے اس لحاظ سے یہ گوری قومیں سیاسی اور تاریخی بصیرت کے اعتبار سے کیا عہدِ طفلی سے گزر رہی ہیں؟

بہر حال تاریخ کا لکھا تو ہمیشہ پورا ہوتا ہے۔ آپ کو کالی کھانسی

پہلا دن

آج نئی ہیروئن کی شوٹنگ کا پہلا دن تھا۔

میک اپ روم میں نئی ہیروئن سُرخ مخمل کے گدّے والے خوبصورت اسٹول پر بیٹھی تھی اور ہیڈ میک اپ مین اُس کے چہرے کا میک اپ کر رہا تھا۔ ایک اسسٹینٹ اس کے دائیں بازو کا میک اپ کر رہا تھا۔ دوسرا اسسٹینٹ اس کے بائیں بازو کا۔ تیسرا اسسٹینٹ نئی ہیروئن کے پاؤں کی آرائش میں مصروف تھا۔ ایک ہیئر ڈریسر عورت نئی ہیروئن کے بالوں کو ہولے ہولے کھولنے میں مصروف تھی۔ سامنے سنگار میز پر پیرس، لندن اور ہالی وڈ کا سامانِ آرائش بکھرا ہوا تھا۔

ہو یا گوری ۔۔۔۔۔۔ انسانی ترقی کے لئے دونوں طرح کھانسی مُضر ہوتی ہے۔

کھانسی ایک عارضہ ہے ایک عادت ہے۔ ایک دوا بھی ہے محبت اور کھانسی کا روزِ ازل سے ساتھ ہے۔ کہتے ہیں۔ باغِ ارم میں آدمؑ ہی نے سب سے پہلے کھانس کر حوّا کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ آج کل لوگ محبوب دلنواز کو دیکھ کر چٹکی بجاتے ہیں۔ آنکھ مارتے ہیں۔ شی شی کرتے ہیں۔ فلمی گیت گاتے ہیں۔ یا قریب آکر زور کا قہقہہ لگاتے ہیں۔ یہ سب غلیظ حرکتیں ہیں اور صرف شہدوں کو زیب دیتی ہیں۔ آج بھی محبوب کو اپنی طرف متوجّہ کرنے کا مہذّب ترین طریقہ کھانسی ہے۔ ایک ہلکی سی، جھجکتی ہوئی سی۔ مہذّب، متمدّن کھانسی جو کھانسی سے زیادہ محبوب کے دروازے پر دستک ہی معلوم ہوتی ہے۔ کیا مجھے اجازت ہے؟۔ میں آپ سے بات کرلوں۔ ؟؟ آپ کو سمندر کے کنارے چہل قدمی کی دعوت دوں؟ آشیانے میں بہت عمدہ پکچر آئی ہے؟۔ محبوب اگر سمجھدار ہوگا تو اس کھانسی کے بعد ضرور پلٹ کر دیکھے گا۔ اس کے آگے جو ہوگا وہ بہت کچھ حالات زمانے، جائے وقوع، آپ کی جیب اور محبوب کے مزاج کے مطابق ہوگا۔

کھانسی تو محض ایک شریفانہ تعارف ہے اور آج کل یہ شریفانہ تعارف بھی کسے ملتا ہے؟۔

ایک دفعہ سقراط سے افلاطون نے پوچھا۔
"زندگی میں کون سی شے ناگزیر ہے؟ — عشق؟ — مایوسی؟ خوشامد؟"
سقراط نے سوچ سوچ کر کہا۔
"کھانسی؟"
واقعی ذرا سوچیئے تو اُستادِ کامل کے اس سادہ سے جواب میں زندگی کی کتنی بڑی حقیقت پنہاں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ آپ کو زندگی میں کبھی کسی سے عشق نہ ہو۔ کبھی کسی سے مایوسی نہ ہو۔ کبھی کسی کی آپ نے خوشامد نہ کی ہو۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کو کبھی کھانسی نہ آئی ہو — اِس تنگنائے دہر میں زندگی اور کھانسی کچھ اس طرح لازم اور ملزوم ہیں جس طرح پھول کے ساتھ کانٹے! عورت کے ساتھ بدمزاجی اور حاکم کے ساتھ رشوت کا تصوّر ضروری ہے۔ مگر یہ کھانسی ہوتی کیوں ہے؟
پھول اپنی مدافعت کے لئے کانٹے رکھتے ہیں۔
عورت اپنے حُسن کی خاطر بدمزاجی کا مظاہرہ کرتی ہے۔
حاکم اپنی قوّت کی افزائش کے لئے رشوت لیتے ہیں۔
مگر زندگی کھانستی کیوں ہے؟
یہ کھانستی ہوئی کیوں ہے؟
افلاطون کے سینے میں جب یہ دوسرا سوال کلبلایا تو اس نے

بے چین ہو کر اپنی نگاہیں اُٹھا کر سقراط کی طرف دیکھا اور پوچھا۔
"مگر یہ کھانستی ہوئی کیوں ہے؟"
مگر سقراط ایک ہی کائیاں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ افلاطون کے دوسرے سوال کا جواب نہیں دے سکے گا، اس لئے اُس نے اس سوال کے پوچھے جانے سے پیشتر ہی زہر کا پیالہ پی لیا تھا، اور اب سقراط افلاطون کو جواب دیئے بغیر عالمِ سکرات میں چلا گیا تھا۔
تاریخداں سُقراط کی مَوت کے جواز میں طرح طرح کی تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ مگر وہ سب غلط ہیں۔ اصلی وجہ وہی ہے جو میں نے آپ کو بتائی ہے اور وہ اس لئے صحیح ہے کہ مجھ سے زیادہ زندگی میں آج تک کوئی نہیں کھانستا مجھ سے زیادہ آج تک کسی نے کھانسی کو نہ برتا ہے نہ سمجھا ہے جس عمر میں بچے اپنی ماں کے سینے سے لگ کر دودھ پیتے ہیں میں صرف کھانستا تھا۔ اور اتنی زور سے کھانستا تھا کہ کھانسی سے میری ماں روہانسی ہو جاتی تھی۔ جس عمر میں لڑکے اسکول جاتے ہیں اُس عُمر میں میں اپنے ڈیسک پر کھڑا ہو کر اِس زور سے کھانستا تھا کہ اُستاد کلاس روم چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے اور لڑکے شاباش کہہ کر مجھے اپنے کاندھے پر بٹھا لیتے تھے۔ جس عمر میں نوجوان محبّت کی میٹھی میٹھی باتیں کرتے اور ایکدوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہیں۔ میں محض کمر میں ہات ڈالتا تھا اور کھانستا تھا۔
محبوب اگر خوش ادا ہوا تو صرف مُدعا زبان پر لایا۔ اگر سیخ پا ہوا

تو عرض کیا کہ خاکسار نے تو محض کھانسی سے عاجز آ کر آپ کی کمر کا سہارا لیا تھا۔ اس پر کسی کو کیا معلوم کہ ہماری کھانسی کی صدا کیا گل کتر گئی اور کسی رقیب کی باتوں میں گگولکی وہ خوشبو نہ تھی جو کبھی ہماری کھانسی میں تھی۔ الغرض میری زندگی مسلسل ایک رومال رہی ہے۔ میں کہیں زندگی کے ہر مقام پر متواتر کھانستا چلا گیا ہوں۔ اکثر میری کھانسی سے عاجز آ کر صاحب اقتدار لوگوں نے مجھے زہر کا پیالہ پیش کیا ہے مگر میں کوئی سقراط نہیں جو اُسے خاموشی سے پی جاؤں۔ میں تو جب تک زندہ رہوں گا اسی طرح کھانستا رہوں گا۔ اور جب میں مر جاؤں گا تو لوگ میری کھانسی کو یاد کر لیا کریں گے اور اسے اس طرح ڈھونڈیں گے جس طرح کسی کھوئے ہوئے بچے کو یا بھولے ہوئے شعر کو۔۔۔!

✢

بینک بینک فٹینک

"دس سال سے ایک کہانی بیچنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر کسی طرح سے بکتی ہی نہیں" میں نے دلاور سے کہا۔

دلاور اور میں شری راؤنڈ اسٹوڈیو کی کینٹین میں بیٹھے دو دن کا پرانا بھنا ہوا گوشت، ایک ہفتے کی پرانی ڈبل روٹی کے ساتھ کھا رہے تھے۔ چٹنی البتہ تازہ تھی اور پیاز کے لچھے بھی۔ اور ہم ہر لقمے میں اتنی چٹنی اور پیاز بھر لیتے تھے جس سے بدمزہ باسی گوشت کا ذائقہ چھپ جاتا تھا۔ اور چٹنی پیاز کا کرارہ پن ابھر آتا ہے۔

بالکل اسی بور فلم کی طرح جس میں ایک آدھ دلچسپ سین کبھی کبھی چمک جاتا ہے۔

"کہانی کیا ہے؟" دلاور نے سخت جان ڈبل روٹی کو دانتوں سے توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

دلاور کے دانت اور جبڑے بڑے مضبوط اور گھوڑے سے مشابہ تھے۔ اس کی آواز بھی بڑی بھاری اور پاٹ دار تھی ۔ دلاور کا خیال تھا۔ کہ وہ ڈبل روٹی اپنے دانتوں سے توڑتا ہے۔ میرا گمان تھا کہ روٹی خود بخود اس کی بھاری بھرکم آواز سُن کر سہم جاتی ہے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ حالانکہ مجھے اُسی روٹی کو نرم کرنے کے لئے پانی استعمال کرنا پڑتا ہے۔

میں گزشتہ دس سال سے فلموں میں تھا اور ابھی تک ایک کہانی نہیں بیچ پایا تھا۔ کہیں کہیں منظر نامہ اور مکالمہ لکھنے کو مِل جاتا تھا۔ اُس پر گزر تھی۔

بخلاف اس کے دلاور کو فلموں میں آئے ہوئے صرف دو سال ہوئے تھے۔ اِن دو سالوں میں وہ چھ کہانیاں لکھ کر بیچ چُکا تھا۔ کم داموں میں مگر چھ کہانیاں تو بیچی تھیں اُس نے۔ اب وہ جوہو پر ایک چھوٹے سے کاٹج میں رہتا تھا اور میرے پاس چونکہ کوئی جگہ نہ تھی اِس لئے میں بھی اُس کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ دلاور نے سات سو روپے دے کر ایک پُرانی کھٹارہ سٹران

خریدلی تھی۔ اور اُس پر نیا رنگ روغن کر کے اور کچھ کل پرزے بدل کے اُسے اس قابل کر لیا تھا کہ ہم دونوں اس میں بیٹھ کے فلم اسٹوڈیو کے چکّر لگا سکیں۔ دلاور نے اپنی کاٹج کے باہر ایک چھوٹی سی تختی لگا دی تھی۔ اُس پر لکھا تھا۔

"دوزخ"!

دلاور بہت دلچسپ آدمی تھا، پھرتیلا، شریر، کسرتی، اور دبنگ میں بالکل اُس کی ضد تھا۔ خاموش، نرم گفتار، سُست الوجود، شاید اسی وجہ سے ہم دونوں میں بہت گھٹنے لگی تھی۔

"کہانی کا مرکزی خیال بہت عمدہ ہے" میں نے اُسے بتایا "ایک ہیرو ہے"

"وہ تو ہوگا ہی سالا" دلاور نے ہیرو کو گالی دیتے ہوئے کہا۔

دلاور ہیرو کے بارے میں بہت تلخ نوائی کا ثبوت دیتا تھا کیونکہ وہ فلموں میں ہیرو بننے کے لئے آیا تھا اور اُسے مجبوراً زندہ رہنے کے لئے افسانہ نگار بننا پڑا!

"ایک اُس کی ماں ہے" میں نے بتایا۔

"وہ تو ہوگی ہی۔ ماں کے بغیر بھی بیٹا ہو سکتا ہے؟ سالے تو کیا بات کرتا ہے۔ کیا کہانی سُناتا ہے؟ ایک ماں تھی۔ ایک بیٹا تھا۔ سالے شکارپور کا حجّام تجھ سے بہتر کہانی سُنا سکتا ہے"

دلاور نے زور کا ایک دھپ میری پیٹھ پر دیا۔ میں آزردہ ہو کر چُپ ہو گیا۔

"آگے ؟" دلاور نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" میں نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔

دلاور چند لمحوں کے لئے چُپ رہا۔ مجھے گھورتا رہا۔ پھر پھٹ پڑا اور بیس پچیس گالیاں سُنانے کے بعد بولا۔

"عجیب گاؤدی سے پالا پڑا ہے۔ دس سال سے ایک ہی کہانی لئے پھرتا ہے۔ اور ابھی تک اُسے بیچ نہیں پایا، اور کہتا ہے اس کا مرکزی خیال بہت اچھا ہے"

"ہاں۔ جو سُنتا ہے وہ یہی کہتا ہے۔ کہانی بہت اچھی ہے" میں نے کہا۔

"مگر خریدتا کوئی نہیں" دلاور نے پوچھا "کیوں ؟"

"کہتے ہیں کہانی میں دھماکا نہیں ہے"

"وہ ہم ڈالدیں گے۔ تو کہانی تو سُنا" دلاور نے یکایک نرم لہجہ میں کہا "مجھے پسند آئی تو میں تم سے خرید لوں گا۔ ورنہ کسی دوسرے کے ہاں بکوا دوں گا۔ مگر پہلے پوری کہانی سُنانے سے پہلے مجھے اس کا مرکزی خیال بتا دے"

میں نے کہا "ایک ہیرو ہے۔ ایک ماں ہے۔ ایک اُسکی

محبوبہ ہے۔"

"محبوبہ کس کی ہے، ماں کی؟" دلاور نے پوچھا۔

"نہیں — ہیرو کی — مذاق کیوں کرتے ہو؟" میں نے بھڑک کر کہا۔

"تو ایسے مر! یوں بول ایک ہیرو ہے۔ ایک ماں ہے۔ ایک ہیرو کی محبوبہ ہے۔ گڑبڑاتا کیوں ہے؟"

میں نے کہا۔

"ماں بہت غریب ہے اور بیوہ ہے — اور اس نے بڑی محنت سے اور مشقت سے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کے بیٹے کو پڑھایا لکھایا اور جوان کیا ہے۔ اور جب بیٹا جوان ہو جاتا ہے تو اُسے ایک لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے اور لڑکی کو بھی اُس سے ہو جاتی ہے۔"

"حیرت ہے صاحب! لڑکی کو بھی محبت ہو جاتی ہے۔" دلاور بولا۔ "ایسا عجیب قصہ تو ہم نے آج تک نہیں سُنا۔"

مجھے غصہ تو بہت آیا، مگر میں پی گیا۔ کیونکہ میں بھی اب کہانی سُنانے پر تُل گیا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے کھولتے ہوئے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"بیچ کے بہت سے واقعات کٹ کرتا ہوں۔ قصہ مختصر یہ کہ بیٹے کی محبت دیکھ کر ماں بھی مان جاتی ہے اور دونوں کی شادی طے ہو جاتی ہے۔"

"ماں کی شادی بیٹے کے ساتھ طے کرا رہے ہو؟" دلاور نے پوچھا۔

"ماں کی بیٹے سے نہیں۔ ماں کی ہیروئن سے۔ آ۔ میرا مطلب ہے۔ کہ بیٹے کی ہیروئن سے شادی طے ہو جاتی ہے" میں نے غصّے سے بھڑک کر کہا۔ اور پھر اپنے غصّے کو روک کر جلدی جلدی کہانی سنانے لگا۔ "شادی سے ایک ماہ پہلے ہیروئن بیمار پڑ جاتی ہے۔ اسے لیوکومیا ہو گیا ہے"

"وہ کیا ہوتا ہے۔ لقوہ قسم کی کوئی چیز؟"

"نہیں، خون کا سرطان، ایک طرح خون کا کینسر ہوتا ہے۔ Cancer of the Blood اور اس کا صرف ایک علاج ہے کہ مریضہ کا خون بدل دیا جائے۔ مگر مریضہ کے جسم کا خون ایک خاص قسم کا ہے جو بہت مشکل سے ملتا ہے۔ تلاشِ بسیار کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ خون تو مل جائے گا مگر اُس کی قیمت کئی ہزار روپے ہو گی۔ یہ قیمت نہ ہیرو ادا کر سکتا ہے نہ ہیروئن۔

اب ہیروئن کا مرنا یقینی ہے۔ اُسے اس موت سے صرف ہیرو کی ماں بچا سکتی ہے۔ کیونکہ ہیرو کی ماں کے خون کی قسم بھی وہی ہے جو ہیروئن کے خون کی ہے۔ اب ہیرو عجیب مشکل میں ہے۔ ماں سے خون دینے کے لئے کہتا ہے۔ تو ماں کی جان جاتی ہے۔ نہیں کہتا ہے تو ہیروئن کی جان جاتی ہے"

ایک وقت وہ تھا، جب اس ہیروئن کو ایک معمولی جاپانی لپ اسٹک کے لئے ہفتوں اپنے شوہر سے لڑنا پڑتا تھا۔ اُس وقت اس کا شوہر مدن اسی میک اپ روم کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا خاموشی سے یہی سوچ سوچ کر مسکرا رہا تھا۔ کیسی مشکل زندگی تھی اُن دونوں کی ....

آج سے تین سال پہلے مدن دہلی میں کلرک تھا۔ تھرڈ ڈویژن کلرک اور ایک سو ساٹھ روپے تنخواہ پاتا تھا۔ ناداری اور غربت کی زندگی تھی۔ کبھی کوٹ کا کالر پھٹا ہے، تو کبھی قمیض کی آستین، تو کبھی بلاوز کی پُشت ۔ آگے پیچھے جدھر سے وہ دہلی کی زندگی کو دیکھتا تھا، اُسے وہ زندگی کٹی پھٹی بوسیدہ اور تار تار نظر آتی ہے۔ ایسی زندگی جس میں کوئی آسمان نہیں ہوتا۔ کوئی پھول نہیں ہوتا۔ کوئی مسکراہٹ نہیں ہوتی، ایک نیم فاقہ زدہ جھلائی کھسیائی ہوئی زندگی جو ایک پُرانی، بدبودار ترپال کی طرح دنوں، مہینوں اور سالوں کے کھونٹوں سے بندھی ہوئی ہر وقت احساس پر چھائی رہتی ہے۔ مدن اس زندگی کے ہر کھونٹے کو توڑ دینا چاہتا تھا، اور کسی موقعے کی تلاش میں تھا۔

یہ موقع اُسے ملک گردھاری لال نے دے دیا۔ ملک گردھاری لال اُس کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ انہیں دنوں میں دفتر میں ایک اسسٹینٹ کی نئی آسامی منظور ہوئی تھی، جس کے لئے مدن نے بھی درخواست دی تھی ـــــ اور مدن سینیئر تھا اور لائق بھی تھا اور ملک گردھاری لال کا چہیتا بھی تھا۔ ملک گردھاری لال نے

"بس بس ۔ آگے مت بتاؤ" دلاور نے کہا "میں سب سمجھ گیا ۔

"کیا سمجھے ؟" میں نے حیران ہو کر کہا ۔

دلاور نے کینٹین کی میز سے اُٹھتے ہوئے کہا ۔

"میرے ساتھ موٹو بھائی کے دفتر میں چلے آؤ ۔ ابھی اسی وقت کہانی بیچ کر دکھاتا ہوں"

موٹو بھائی پروڈکشنز کے چپراسی نے ہمارا راستہ روکتے ہوئے ہم سے کہا ۔

"سیٹھ اندر کام کر رہا ہے ۔ بولتا ہے ، اندر کسی کو مت آنے دو"

دلاور نے چپراسی کو ہات کے ایک جھٹکے سے پرے پھینک دیا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا ۔ موٹو بھائی نے مجھے اور دلاور کو یوں بلا اجازت اندر گھستے دیکھ کر شدید حیرت کا اظہار کیا ، کیونکہ وہ اس وقت دو ڈسٹری بیوٹروں سے بزنس کی گفتگو میں مصروف تھا ۔

دلاور نے اندر آتے ہی دروازہ زور سے بند کیا اور چٹخنی چڑھا دی ۔ اور بلند و بانگ لہجے میں بولا "اب کوئی شخص آدھے گھنٹے

کے لئے باہر نہیں جا سکتا۔"

"مگر میں اس وقت مصروف ہوں۔" سیٹھ موٹو بھائی بولا "تم تو دیکھتا ہے دلاور بھائی — یہ میرا بنگال کا ڈسٹری بیوٹر بیٹھا ہے سیٹھ اوتر چند — یہ میرا حیدر آباد کا ڈسٹری بیوٹر ہے، سیٹھ فجلہ بھائی۔"

"فضل بھائی —" حیدر آباد کے ڈسٹری بیوٹر نے اپنا صحیح نام بتایا۔

"ہاں سیٹھ پھاجل بھائی۔" موٹو بھائی نے تصحیح منظور کرتے ہوئے کہا "اس ٹائم کو میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔"

دلاور گرج کر بولا۔

"سیٹھ! صرف آدھا گھنٹہ مانگتا ہوں — ایک کہانی کا آئیڈیا سنانے آیا ہوں — کہانی سن کر پھڑک نہ جاؤ سیٹھ تو میری جوتی میرا سر۔"

یہ کہہ کر دلاور نے اپنے پاؤں سے جوتی نکال کر سامنے کانچ کی تپائی پر رکھ دی۔

سب لوگ حیرت سے جوتی کو دیکھنے لگے۔ پھر سب لوگ اس سے بھی شدید حیرت سے دلاور کے سر کو دیکھنے لگے۔ مگر دلاور نے انہیں آگے سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ بولا۔

"سیٹھ! کہانی شروع کرتا ہوں — پردہ اسکرین پر ایک جوتا آتا

ہے۔ ڈبل سول کا جوتا ـــ یہ جوتا ہیرو کا ہے۔ ہیرو اپنے جوتے سے زور کی ایک ٹھوکر مارتا ہے۔ ولین کے سر پر۔ ولین لڑھکتا ہوا پیچھے جاتا ہے۔ کیمرہ بھاگتا ہوا آگے جاتا ہے۔ زینے کے پیچھے سے دو غنڈے ولین کے نمودار ہوتے ہیں۔ ہاتھ میں شمشیرِ بے نیام کمر میں آفتابِ صُمم صُمام ـــ آنکھوں پہ سیاہ نقاب۔ گردن میں غوطہ گرداب ـــ وہ حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں کہ فوراً پلٹ کر ہیرو اُن کے سامنے آجاتا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور ہے ـــ ریوالور ہے ـــ ریوالور ہے ـــ ریوالور کا دہانہ آگے آتا ہے ـــ آگے آتا ہے ـــ آگے آتا ہے ـــ اور یکایک پردۂ اسکرین پر تین گولیاں چلتی ہیں ـــ

"بینگ بینگ فٹینگ"

اور ٹائیٹل شروع ہوتے ہیں ـــ

"یہ بینگ بینگ فٹینگ کیا ہے؟" سیٹھ اوترچند نے دلاور سے پوچھا۔

"فلم کا ٹائیٹل ہے" دلاور نے بتایا۔

دونوں ڈسٹری بیوٹروں نے مسرت اور حیرت سے ایکدوسرے کی طرف دیکھا ـــ بلاشبہ آج تک کسی فلم کمپنی نے ایسا ٹائیٹل نہیں دیا تھا ـــ دونوں ڈسٹری بیوٹر اپنی کرسیاں کھسکا کے دلاور کے قریب چلے آئے۔ دلاور بھانپ کر بولا ـــ "موٹو بھائی! کہانی آگے سُناؤں

کہ نہیں؟"

موٹو بھائی بھی ڈسٹری بیوٹروں کی دلچسپی بھانپ چکا تھا۔ فوراً لہجہ بدل کر شیریں انداز میں بولا۔

"نہیں نہیں — دلاور بھائی، اوپننگ تو اکدم دھانسو ہے۔ اب تو کہانی سنانی پڑے گی — کیوں فجلہ بھائی؟" موٹو بھائی نے حیدر آباد کے ڈسٹری بیوٹر سے تائید چاہی۔

"فضل بھائی" حیدر آباد کے ڈسٹری بیوٹر نے کسی قدر بیزار ہو کر پھر اپنا صحیح نام بتایا اور کسی قدر گھبرا کر اپنے قریب کی کرسی پر بیٹھی ہوئی مس آرا دھنا کی طرف دیکھا۔

مس آرا دھنا موٹو بھائی کی فلم "سندباد کی بیٹی" کی ہیروئن تھیں مگر کام ہیرو کا کرتی تھیں — یعنی گھوڑا دوڑانا، بندوق چلانا، دیوار سے کود پڑنا — پہاڑ سے چھلانگ لگا کے سمندر میں تیرنے لگنا وغیرہ وغیرہ — اُسے شادی کرنے کا بہت شوق تھا۔ اب تک تین دفعہ طلاق لے چکی تھیں اور چوتھے کی فکر میں تھیں — سیٹھ فضل بھائی بڑی میٹھی میٹھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس لئے جب موٹو بھائی اُس کا نام غلط پکارتا تو اُسے بہت غصہ آتا تھا۔ اور وہ کسی قدر گھبرا کر مس آرا دھنا کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ مگر مس آرا دھنا کو اُس کے بگڑے ہوئے نام میں کسی طرح کی قباحت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ فلموں میں آنے سے پہلے خود اس کا نام مس گھیلا بائی بندوق والا

تھا"!

دلاور نے ایک نظر مس آرادھنا کی طرف دیکھا۔ سُلگتی ہوئی آنکھیں سُلگتے ہوئے ہونٹ، بھرے ہوئے پستول کی طرح اُس کی خطرناک جوانی تھی۔

"اب میں فلم کا آخری سین سُناتا ہوں" دلاور یکایک اپنی کرسی پر اکڑوں ہو کے بیٹھ گیا۔ اور پیشتر اس کے کہ کوئی اعتراض کرے کہ فلم کا پہلا سین سُنانے کے بعد آخری سین کیوں سُناتے ہو۔ وہ شروع ہو گیا۔

"ذرا دھیان سے سننا۔ یہ فلم کا اختتام ہے End ہے۔ ایسا چکر دھاری خاتمہ دیا ہوں کہ جو سُنے گا اُس کے دُھرّے اُڑ جائیں گے۔ جو دیکھے گا بنٹا ڈھار ہو جائے گا۔ بینگ بینگ فینگ۔ سالا کیا رول دیا ہے للتا پوار کو"

"کیا دیا ہے؟" موٹو بھائی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہیرو کی ماں کا۔ مگر کیا رول دیا ہے سیٹھ؟" دلاور کرسی سے اُچھل کر موٹو بھائی کے قریب کے صوفے پر جا بیٹھا۔ بولا "اور للتا بائی بھی اِس فلم میں وہ کام کرے گی، وہ کام کرے گی کہ سب کی دوکان پھاڑ کے رکھ دے گی"

"وہ کیسے؟"

"کان کھول کے سُن سیٹھ موٹو بھائی۔ زندگی میں آج تک

ایسی کہانی نہیں سُنی ہوگی ــــ آج تک ایسی فلم نہیں بنائی ہوگی۔ للتا پوار ہیرو کی ماں ہے ــــ وہ چاہتی ہے کہ ہیرو کی شادی اس سے ہوجائے ــــ مگر ہیروئن اِنکاری ہے۔ کیونکہ اس کو خون کا لقوہ ہے "

" خون کا لقوہ؟" سیٹھ اوتر چند نے پوچھا۔

" لیوکومیابٹ" میں نے کہا۔

دلاور گرج کر بولا ــــ

" خون کا لقوہ ــــ میں نے خود ڈاکٹروں سے معلوم کیا ہے۔ بڑی خطرناک بیماری ہوتی ہے اور اس کا علاج صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مریض کے جسم سے سارا لقوے کا خون نکال لیا جاتا اور کسی دوسرے تندرست آدمی کا سارا خون اس کو دے دیا جاتا ہے ــــ سمجھتے ہو موٹو بھائی بــــ سارا خون ــــ یعنی خون کے بدلے خون۔

اب جو آدمی اپنا خون دے گا ــــ سارا خون دے گا، سالا وہ مرے گا کہ نہیں؟ اور نہیں دے گا تو مریض مرجائے گا۔ اب ایسی اُلجھن ہیں آخر میں کہانی کو لے کے آیا ہوں کہ دیکھنے والا دیکھے تو چکر گھنی کھا جائے ــــ عقل غوطۂ گرداب میں اور دل ورطۂ استعجاب میں، کیونکہ ہیروئن کو اگر کوئی ٹھیک کرسکتا ہے تو وہ ہیرو کی ماں ہے، جس کے خون کا نمبر ہیروئن کے خون کے نمبر سے ملتا ہے، اور

سارے شہر میں صرف دو ہی آدمی ایسے ہیں جن کے خون کا نمبر ہیروئن کے خون سے ملتا ہے۔

ایک تو ہے ولین ——!

دوسری ہیرو کی ماں ——!

اب ہیرو بے چارہ کیا کرے۔ ولین کے پاس جا نہیں سکتا اور ماں سے خون مانگ نہیں سکتا۔ اور خود سے خون دے نہیں سکتا۔ کیونکہ اسکے خون کا نمبر ہیروئن کے خون سے مختلف ہے۔ آہاہا۔ کیا دھڑلے دار سچویشن ہے؟ —— ساری فلم انڈسٹری کی آنکھ میں ڈنڈا دے دیا ہوں —— ہے کوئی مائی کا لال۔ ایسی گھنگھور گھتار سچویشن کا بنانے والا ——؟

مگر شاباش ہے للتا پوار پر، وہ جب سنتی ہے، کہ اُس کے خون دینے سے مری ہوئی ہیروئن کی جان بچ سکتی ہے تو ہونکتی، ہانپتی، اٹھتی بیٹھتی، گرتی پڑتی، جھکتی لڑھکتی ہسپتال کے اندر پہنچ جاتی ہے اور پستول نکال کر ڈاکٹر کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اس کے جسم کا سارا خون نکال کے ہیروئن کے جسم میں ڈال دے۔

آہا کیا سچویشن ہے!

اِدھر ہیروئن طاقت پکڑتی ہے اُدھر ماں مرتی جاتی ہے۔ جان دے دی اپنے بیٹے کے عشق کی خاطر۔ کس کہانی میں یہ سچویشن ہے؟ مجھ کو بتاؤ —— لیلیٰ مجنوں —— کہ ہیر رانجھا کہ رومیو جیولیٹ

میں ہے۔ اور ذرا سوچو کہ جب للتا پوار اس رول میں کام کرے گی تو دوکان پھاڑ کے رکھ دے گی سب کی ؟"

میں نے غور سے دیکھا موٹو بھائی کی آنکھ میں آنسو تھے، اور دونوں ڈسٹری بیوٹر سچویشن کے خوف سے دم بخود تھے۔

دلاور نے زور سے کانچ کی تپائی پر مُکا مار کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ بولا۔

"مگر ہیرو کی ماں مرتی نہیں ہے" اس نے گرج کر اعلان کیا۔

"نہیں مرتی ہے ؟" موٹو بھائی نے حیرت سے پوچھا۔

"مر جائے تو کہانی کیا ہوئی جی ۔ جناب ! ماں مرتی نہیں ہے اس کو ہیروئن بچا لیتی ہے"

"کیسے ؟"

"ایسے" دلاور نے چلا کر کہا اور مس آرادھنا کے ہاتھ سے پانی کا گلاس چھین لیا اور بولا "ہیروئن آپریشن کی میز سے اٹھتے ہی پستول ایسے ماں کے ہاتھ سے چھین کر باہر بھاگ جاتی ہے۔ اور ہیرو کی موٹر میں سوار ہو کر شہر سے باہر چلی جاتی ہے شہر ختم ہو گیا ۔ سڑک ختم ہو گئی ۔ موٹر رک گئی۔

ہیروئن نے جھپاک سے موٹر کا پٹ کھولا۔ دھڑاک سے چلتے ہوئے ایک گھوڑ سوار کو روکا۔ پٹاک سے نیچے گرایا،

اور دھماک سے خود اوپر چڑھ بیٹھی ، اور فٹافٹ ، فٹافٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے وِلین کے قلعے کے اندر جا پہنچی ۔ اور نقاب پوش حسینہ بن کر اس نے وِلین کو جا گھیرا ۔

اور پھر وہ گھمسان کی لڑائی ہوئی دونوں میں ۔ بینگ بینگ فیٹنگ — دھوم دھام دھڑام — فڑوں فڑاں فٹانچ — گھورناک ، غضبناک ، گھمسان ، غنٹر وپنچ لڑائی ہوئی جس میں ہیروئن نے چابک مار مار کر ولین کی دھجیاں بکھیر ڈالیں — اور اُسے کمند اصفہانی میں ڈال کے شفاخانۂ ایرانی لے آئی اور رسّی سے گھسیٹتے ہوئے ولین کو ڈاکٹر کے قدموں میں ڈالتے ہوئے بولی ۔

" نکالو اس کی رگوں سے خون اور بچالو میرے ہیرو کی ماں کو ۔"

" یہ لو ، کیسی کہانی ہے ؟" دلاور نے یکایک کانچ کا گلاس زور سے دیوار پہ دے مارا اور شکستہ کانچ کے جھنا کے ساتھ خود بھی خاموش ہو گیا ۔

میں نے دیکھا ، سارے کمرے میں سنّاٹا تھا ۔ ایک کونے میں تپائی ٹوٹی پڑی تھی ۔ دوسرے کونے میں کانچ کے گلاس کے ٹکڑے پڑے تھے ۔ تیسرے کونے میں مس آرادھنا کا چہرہ ، ولین کی لڑائی کے تصوّر سے سُرخ تھا ، اور دونوں ڈسٹری بیوٹر کہانی کے انجام

میں ڈوبے ہوئے تھے ـــ صرف موٹو بھائی نے کہانی کے تاثر سے بچ نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

" مگر یہ تو تم نے کہانی کا شروع سُنایا، پھر آخر سُنایا۔ بیچ کا حصّہ تو سنایا ہی نہیں "

" وہ کانٹریکٹ کے بعد " دلاور نے موٹو بھائی کو دھمکاتے ہوئے کہا " پہلے کانٹریکٹ کرو چھ ہزار کا، تین سو ایڈوانس دو پھر آگے بات کرو جی! جناب!! ـــ ایسی کچّی گولیاں ہم نہیں کھیلے ہیں ساری کہانی اِکدم سُنا دیں " دلاور نے ایک فاتح مُرغ کی طرح سینہ پُھلا کے چاروں طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

بنیگ بینگ فٹینگ، پکچر کے سلسلے میں جب ہم تین سو روپے کا ایڈوانس لے کر شری راؤنڈ اسٹوڈیو سے باہر نکلے تو میں نے دِلاور سے پوچھا ـــ

" بھیّا مجھے کم سے کم اتنا بتا دو۔ یہ بینگ بینگ فٹینگ ـــ دھوم دھام دھڑا کا۔ فٹروں فٹراں فٹانچ ـــ گھمسان غٹرونچ ـــ دُکان پھاڑ ـــ آنکھوں میں ڈنڈا دینا ـــ وغیرہ وغیرہ کس زبان کے الفاظ ہیں، جن کی مدد سے تم نے یہ کہانی بیچی ہے ـــ

جب اُس کی عرضی پڑھی تو اُسے اپنے پاس بلایا اور کہا۔

"مدن! تمہاری عرضی میں کئی نقص ہیں۔"

"تو آپ ہی کوئی گُر بتائیے۔"

ملک گردھاری لال نے قدرے توقف کے بعد مدن کی عرضی اُسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"آج رات کو میں تمہارے گھر آؤں گا اور تمہیں بتاؤں گا۔"

مدن بے حد خوش ہوا۔ گھر جا کر اُس نے اپنی بیوی پریم لتا سے خاص طور پر اچھا کھانا تیار کرنے کی فرمائش کی۔ پریم لتا نے بڑی محنت سے روغن جوش، پنیر مٹر، اور آلو گوبھی اور گچھیوں والا پلاؤ تیار کیا۔

سرِ شام ہی ملک گردھاری لال مدن کے گھر آگیا اور ساتھ ہی وہسکی کی ایک بوتل بھی لیتا آیا۔ پریم لتا نے جلدی سے پاپڑ تلے، بیسن اور پیاز کے پکوڑے تیار کئے اور پلیٹوں میں سجا کر بیچ بیچ میں خود آکر اُنہیں پیش کرتی رہی۔

چوتھے پیگ پر وہ پالک کے ساگ والی پھلکیاں پلیٹ میں سجا کے لائی تو ملک گردھاری لال نے بے اختیار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔

"پریم لتا! تو بھی بیٹھ جا اور آج ہمارے ساتھ وہسکی کی چسکی لگا لے۔ تیرا پتی میرا اسسٹینٹ ہونے جا رہا ہے۔"

میں نے تو آج تک کسی ڈکشنری میں یہ الفاظ اور محاورے نہیں دیکھے"

"ابے احمق۔ گاؤدی۔ خر نا تمام" دلاور نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا "اگر ڈکشنری کے الفاظ کی مدد سے کہانی پک سکتی تو تو آج دس سال سے اس انڈسٹری میں کیوں جھک مار رہا ہے۔ چل فرنانڈیز کی خفیہ بار میں، آج تازہ کلیجی کے تکے کھائیں گے اور بھٹی کی پہلی دھار کا ٹھرا پئیں گے"!

✦

لوکی

سبزیوں میں مجھے بھنڈی بہت پسند ہے ۔ نہ جانے کس بد ذوق نے اس کا نام بھنڈی رکھ دیا ہے ۔ حالانکہ اس کا نام سبز ابرو ہونا چاہیئے ۔ انگریزی میں اگر اسے خاتون کی اُنگلی (Lady finger) کہتے ہیں تو بہت اچھا کہتے ہیں ۔ گو خاتونِ مشرق کی اُنگلیاں بھنڈی سے زیادہ نازک اور مہین ہوتی ہیں ۔ مگر انگریز عورت کی مناسبت سے یہ نام بہت ہی عمدہ ہے ۔ جن لوگوں کو انگریز عورت کی مضبوط اُنگلیوں کا تجربہ ہو چکا ہے ۔ وہ لوگ بھنڈی کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ اور اگر خاتونِ مشرق اور مغرب کی

انگلیوں میں کوئی فرق ہے تو ہمیں اس پر چنداں تعجب نہ کرنا چاہیئے مثل مشہور ہے۔ پانچوں بھنڈیاں برابر نہیں ہوتیں۔

اور اگر آپ نے یہ مثل نہیں سُنی ہوگی تو فیضؔ کا وہ قطعہ تو سُنا ہی ہوگا۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دِل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے

مجھے کریلے بھی پسند ہیں چاہے وہ کڑھائی میں پڑے ہوں، یا نیم پر چڑھے ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے آج تک کسی کریلے کو نیم پر چڑھتے نہیں دیکھا۔ مگر بزرگوں سے سُنا ضرور ہے۔ بزرگوں سے تو یہ بھی سُنا ہے کہ کسی زمانے میں ٹیڑھی کھیر بھی کھائی جاتی تھی۔ مگر اُس زمانے کے لوگوں کے دانت بہت مضبوط ہوا کرتے تھے۔ آج کل بناسپتی گھی کا زمانہ ہے۔ دندان ساز ٹیڑھی کھیر کھانے کا مشورہ نہیں دیتے اور نیم چڑھے کریلے نہیں ملتے ہیں۔ البتہ ایسے کریلے ضرور ملتے ہیں جنہیں کھا کر نیم پر چڑھنے کا خیال آتا ہے۔

مجھے سرسوں کا ساگ بھی پسند ہے۔ کھیتوں کی کھُلی فضا میں جب نوجوان لڑکیاں سرسوں کا ساگ توڑ کر اپنے دامن میں بھر لیتی ہیں تو سرسوں کا ساگ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہی حال پالک کے ساگ کا ہے۔ یہی حال باتھو کے ساگ کا ہے۔ یہی

حال ... چنے کے ساگ کا ہے۔ یہی حال بروا کے ساگ کا ہے۔ ممکن ہے آپ نے بروا کا ساگ نہ کھایا ہو (میں نے بھی نہیں کھایا) لیکن وہ مثل تو ضرور سُنی ہوگی۔

"ہو نہار بروا کے چکنے چکنے پات"

بس اسی سے اندازہ کر لیجئے، کتنا عمدہ ساگ ہوگا؟۔

اور پھر تُرئی؟ جسے پنجاب میں توری کہتے ہیں اور اودھ میں ترئی کہتے ہیں۔ حالانکہ کسی زمانے میں اودھ میں بھی اُسے توری ہی کہتے تھے۔ آج کل بربنائے مخاصمت نہیں کہتے ہیں۔ مگر اُس زمانے میں ضرور کہتے تھے جس زمانے کا یہ گیت ہے۔

"کاہنا۔ آئی توری گلی میں"

صاف معلوم ہوتا ہے، کوئی خوب صورت گوالن ہے۔ اور سر پر توری کا ٹوکرا اُٹھائے کاہن کی گلی میں توری بیچنے آتی ہے۔

"کاہنا۔ آئی توری گلی میں"

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں بھی توری کس قدر مرغوب سبزی ہوگی جس کے آتے ہی کاہن گلی میں آکر کھڑے ہو جاتے تھے۔ آج کل تو عورتیں تُرئی یا توری کا نام سُنتے ہی گھروں کے دروازے بند کر لیتی ہیں۔ مگر اُس زمانے میں یہ بات نہ تھی۔

دراصل ہمارے لوک گیتوں میں ہمارے اسلاف کے خوبصورت کلچر اور تہذیب و تمدن کے کیسے کیسے خزانے بند ہیں، جن سے اُس

زمانے کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ مشہور لوک گیت آج بھی دلہن کے وداع ہونے پر گایا جاتا ہے۔

"بابل مورا نیہر چھوٹا جائے"

صرف یہی گیت اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ ہندوستان پر حملہ آور ہونے والے آریہ لوگ شہر بابل کے رہنے والے تھے۔

میرا جی چاہتا ہے کبھی اس موضوع پر ایک تھیسس لکھوں مگر سمجھے گا کون؟ — اس برصغیر میں پہلے ہی سبزیوں اور دانشوروں کی اس قدر کمی ہے کہ لوگوں کی اشتہا یا دانش پر مزید بوجھ ڈالنا کسی طرح جائز نہیں معلوم ہوتا!

سبزیوں میں ایک سبزی بیگن بھی ہے۔ بیگن دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو جھاڑی کا بیگن ہوتا ہے۔ دوسرا تھالی کا بیگن ہوتا ہے۔ مگر بھرتا دونوں کا بنتا ہے اور بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ بشرطیکہ آپ تھالی میں نہ ہوں۔

مجھے گرمیوں میں بیگن کا بھرتہ اور چکن کا کرتہ دونوں بے حد پسند ہیں — حالانکہ چکن کا کرتہ کھایا نہیں جا سکتا۔ مگر مصیبت کے وقت چبایا تو جا سکتا ہے۔ اور چبانا جو ہے وہ گویا کھانے سے پہلے کی ایک منزل ہے۔ کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔

پھر مٹر کی پھلی ہے۔ لوبیے کی پھلی ہے۔ فرنچ بین ہیں۔ جنہیں یار لوگ فراش بین کہتے ہیں۔ الغرض وہ تمام سبزیاں ہیں جو سبز رنگ

رکھنے کی وجہ سے سبزیاں کہلاتی ہیں۔ پھر وہ سبزیاں بھی ہیں جو سبز رنگ نہ ہونے پر بھی سبزیاں کہلاتی ہیں، جیسے کدو، چقندر، ٹماٹر، مولی، شلجم گاجر، آلو، گوبھی وغیرہ۔ یہ سب اشیائے خوردنی، کچھ لوگوں کے لئے اشیائے خوردنی اور بہت سے لوگوں کے لئے اشیائے دیدنی، سبزی کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ یہ سب مجھے بہت پسند ہیں۔ سوائے ایک لوکی کے ....

میں جب تک اپنے ماں باپ کے گھر میں رہا۔ میں نے لوکی کھائی۔ جب میں کالج کے ہوسٹل میں داخل ہوا۔ جب بھی میں نے لوکی کھائی۔ آج جب کہ میں ایک کرایہ دار مہمان کی حیثیت سے صوفی کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا ہوں۔ برابر لوکی کھا رہا ہوں۔ ممکن ہے اس سے آپ کے دل میں یہ خیال گزرے کہ شاید مجھے لوکی اس قدر مرغوب ہوگی جبھی تو میں اسے برابر بچپن سے کھاتا چلا آ رہا ہوں۔ آپ اس خیال کو اپنے دل سے گزر جانے دیجئے۔ اس کے بعد میں آپ سے بات کروں گا۔ ممکن ہے میں اس سے پہلے ہی آپ کو قتل کر ڈالوں۔ کیونکہ اگر میں اس دنیا میں کسی سبزی سے نفرت کرتا ہوں تو وہ یہ لوکی ہے۔ لوکی! سمجھ گئے آپ۔

مجھے لوکی سے شدید نفرت ہے۔ کیا آپ اس نفرت کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ بچپن ہی سے آپ جس چیز سے نفرت کرتے ہوں۔ ہر روز، تقریباً ہر روز آپ کا سابقہ اُسی شے سے پڑے؟ یہ لوکی کے کوفتے ہیں۔ یہ لوکی کا

رائیتہ ہے ۔ یہ لوکی کا گوشت ہے ۔ یہ لوکی بڑی ہے ۔۔ یہ لوکی ٹماٹر۔ یہ محض لوکی، صرف لوکی ۔ خالی لوکی ۔ بالکل لوکی ۔ خالص لوکی۔ نخالص لوکی ۔ اور لوکی کے سوائے اور کچھ نہیں مگر لوکی ۔۔۔ بچپن سے جوانی تک ۔ گھر سے مس صوفی کے بورڈنگ ہاؤس تک ۔ لوکی ۔ لوکی ۔ لوکی ۔ کیا یہ کسی آدمی کو پاگل بنا دینے کے لئے کافی نہیں ہے۔

اور آخر ہر روز یہ لوکی ہی کیوں کھانے میں ملتی ہے۔ محض اس لئے کہ سستی ہے ؟ محض اس لئے کہ یہ پھیکی اور بے مزہ ہے ؟ اس دنیا میں ہر سبزی کا ایک مزہ ہوتا ہے ۔ ایک ذائقہ ہوتا ہے۔ اس کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے ۔ کریلے کھائیے ۔ صاف معلوم ہوتا ہے، آپ کریلے کھا رہے ہیں مولی کھائیے آپ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ آپ چقندر کھا رہے ہیں۔ فرنچ بین کھائیے کبھی انگریزی بین نہ معلوم ہوں گے ۔ اگر اچھی طرح سے پکا ہو تو اس کے ذائقے میں ہمیشہ ایک تلخی سی باقی رہتی ہے، جیسے اس کا ذائقہ آپ پر ہنس رہا ہو۔ مگر یہ تو فرانسیسیوں کا ہمیشہ سے کردار رہا ہے۔ کسی انگریزی بین سے آپ اس قسم کے کردار کی توقع نہیں کر سکتے ۔

بہر حال میں زیادہ دیر تک فرنچ بین کی تعریف نہ کروں گا۔ ممکن ہے بہت سے لوگوں کو فرنچ بین پسند نہ ہو، اُن لوگوں کے سامنے اسکی تعریف کرنا گویا بھینس کے آگے فرنچ بین بجانا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس دُنیا میں ہر سبزی کا ایک ذائقہ ہے اور اگر نہیں ہے تو اس کمبخت لوکی کا کوئی ذائقہ نہیں ہے۔ اس کا اپنا کوئی

ذائقہ ہی نہیں ہے۔ کوئی مزہ ہی نہیں ہے۔ عجب بے رنگ شخصیت ہے اس کی — یہ نہ کھٹی ہے نہ میٹھی ہے۔ نمکین ہے نہ تلخ ہے۔ کڑوی ہے نہ کسیلی ہے۔ اس کمبخت کا کوئی ذائقہ ہی نہیں ہے۔ مگر جب دیکھئے دسترخوان پر دھری ہوتی ہے۔ میں ساری زندگی اس کے لئے لڑتا رہا ہوں۔ گھر میں ماں باپ کے ساتھ۔ ہاسٹل میں باورچی کے ساتھ۔ بورڈنگ ہاؤس میں مس صوفی کے ساتھ — میں آپ سے سچ کہتا ہوں اب تک میں کب کا پاگل ہو کر پاگل خانے چلا گیا ہوتا۔ مگر بس یہی سوچ کر رہ جاتا ہوں کہ اگر وہاں بھی کھانے کو لوکی ہی ملی تو؟ —

ابھی اُس روز کا ذکر ہے۔ میں اپنے دوست پرویز کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس کے لان پر بیٹھا ہوا لنچ کر رہا تھا۔ سردی کا موسم تھا چمکیلا دن تھا۔ دھوپ صاف اور کھلی تھی۔ کہیں پر بادلوں کا شائبہ نہ تھا۔ لان کی سبز مخملیں دوب مدمقابل، کسی حسین پیکر، کسی دلنواز عربدہ جُو کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اتنے میں صوفی لنچ لے کے آئی۔ لنچ میں لوکی تھی۔ جب وہ نیچے رکھ کر چلی گئی تو میں چند لمحے تو دم بخود سا رہا آخر میں نے پرویز سے کہا۔

"اِس دنیا میں انصاف کہیں نہیں ہے۔"

پرویز نے میرا مطلب غلط سمجھا۔ وہ جس چھاپے خانہ میں نوکر ہے وہاں جو کہانیوں کا رسالہ چھپتا ہے، اُسے میں نے پرویز کی سفارش سے ایک افسانہ بھیجا تھا۔ جو کل ہی واپس آیا تھا۔ ایڈیٹر نے افسانہ واپس کرتے

ہوئے لکھا تھا۔

"آپ کے افسانے میں ایک غریب گڈریئے اور اس کی بھیڑوں کا ذکر ہے۔ ہمارے پڑھنے والے غریب گڈریوں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ نہ انہیں بھیڑوں کے مونڈے جانے کے طریقوں میں کوئی دلکشی نظر آتی ہے۔ آپ کے افسانے میں کوئی عورت نہیں ہے۔ صرف بھیڑیں ہی بھیڑیں ہیں۔ بہتر ہوگا، اگر آپ مقامی رنگ سے احتراز کریں اور اپنے ادب میں ابدیت پیدا کریں۔ علیٰ ہذا القیاس ....!"

پرویز نے سمجھا، میں اُس افسانے کے لوٹائے جانے کے بارے میں شکایت کر رہا ہوں۔ وہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے پر لوکی کا ٹکڑا رکھتے ہوئے بولا۔

"بیچارہ ایڈیٹر سچ تو کہتا ہے۔ اگر تم اپنے افسانے میں بھیڑ کے بجائے عورت رکھ دیتے تو کیا حرج تھا؟"

"تم کیا جانو۔ افسانہ نگاری کیا ہوتی ہے۔" میں نے چلّا کر پرویز سے کہا "تم فورمین ہو۔ تم جس شوق سے لوکی کھاتے ہو۔ اسی رغبت سے عورت کا ذکر کرتے ہو۔ اسی انہماک سے بھیڑ کا گوشت کھاتے ہو۔ تمہیں کیا معلوم بھیڑ اور عورت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ تم قطعاً حساس نہیں ہو۔"

"حساس کیا ہوتا ہے؟" پرویز ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے منہ

میں رکھ کر بولا۔

"حساس! حساس وہ آدمی ہوتا ہے جو لوکی پسند نہ کرے لیکن لوکی کھانے پر مجبور ہو۔ جو خوب صورت عورتوں پر افسانے لکھنا چاہے لیکن بھیڑوں کے ذکر پر مجبور ہو جائے .... کیا تم .... کیا تم دیکھ نہیں سکتے اس وقت میرے سامنے کھانے کی میز پر کیا دھرا ہے؟"

"وہی کچھ ہے جو میں کھا رہا ہوں" پرویز بڑے اطمینان سے بولا "لوکی ہے۔ آخر لوکی میں ایسی کونسی برائی ہے؟"

"مجھے اس کے پھیکے پن سے نفرت ہے پرویز! لوکی کھانے سے تو کہیں بہتر ہے کہ آدمی گھاس کھالے۔ دیکھو اس لان کی ہری ہری گھاس کس قدر عمدہ ہے؟ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ایک بکری ہوتا اور اس گھاس کو کھا جاتا، پھر ایک انسان ہوتا اور اس بکری کو کھا جاتا پھر ایک کارخانہ ہوتا اور وہ مجھے کھا جاتا۔ پھر میری ہڈیاں قبر میں سڑتیں اور ان کے بھر بھرے چورے سے وہی گھاس پھوٹ کر آگتی اور میری ساری قبر پر ہری ہری گھاس کی صورت میں پھیل جاتی۔ جہاں پھر کوئی بکری آکر .... ارے پرویز! کتنا خوبصورت ابدی خیال ہے؟ آج کل مجھے اس قسم کے ابدی خیال بہت ستاتے ہیں۔

لوکی۔ گھاس۔ گوشت، بکری۔ کارخانہ۔ قبر۔ موت شاید میں اسی بہانے اپنے ادب میں ابدیت اور ادبیت میں ابد

پریم لتا سر سے پاؤں تک کانپنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے، کیونکہ آج تک اس کے خاوند کے سوا کسی نے اُسے اس طرح ہاتھ نہ لگایا تھا۔ پھلکیوں کی پلیٹ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی، اور مدن نے گرجکر کہا۔

"ملک گردھاری لال ــــ! میری بیوی کو ہاتھ لگانے کی ہمت تجھے کیسے ہوئی؟"

مدن کا چانس مارا گیا۔ اُس کے بجائے سردار اوتار سنگھ اسسٹینٹ بن گیا۔ پھر چند دنوں کے بعد کسی معمولی غلطی کی بنا پر وہ اپنی نوکری سے الگ کر دیا گیا۔ اور مدن نے کئی ماہ دہلی کے دفتروں میں ٹکریں مارنے کے بعد بمبئی آنے کی ٹھانی۔ کیونکہ اس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی ــــ! مدن کے دوستوں کا خیال تھا کہ پریم لتا اتنی ہی حسین ہے جتنی نسیم پکار میں تھی۔ وحیدہ رحمان پیاسا میں تھی۔ مدھوبالا مغلِ اعظم میں تھی۔ اس لئے مدن کو چاہیئے کہ پریم لتا کو بمبئی لے جائے۔ دہلی میں خوب صورت بیوی والے مرد کی ترقی کے لئے کتنی گنجائش ہے؟ مدن اگر اسسٹینٹ بن بھی جاتا تو زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو روپے پانے لگتا۔ ایک سو ساٹھ کے بجائے ڈھائی سو روپے ــــ! یعنی نوّے روپے کے لئے اپنی عزت گنوا دیتا۔ یہ تو سراسر حماقت ہے۔ اس لئے مدن کو سیدھے بمبئی جانا چاہیئے۔

مگر جب مدن نے پریم لتا سے اس کا ذکر کیا تو وہ کسی طرح راضی

ڈھونڈتا ہوں! عورت کیا ہے؟ مرد کیوں ہے؟ بکری کہاں ہے؟ دشتِ مجنوں کدھر ہے؟ شبِ فراق کیسے کٹی؟ میں بھوکا ہوں ..... نہیں ۔ نہیں ..... بھوک کی بات مت کرو۔ تیسرے درجے کا ادب مت پیدا کرو۔ تم انسان ہو ۔ ارے بھوکا تو کتا بھی رہتا ہے ۔ پھر انسان اور کتے میں کیا فرق ہوا؟ اس لئے بھوک کی بات مت کرو۔ افلاس کی بات مت کرو۔ غریبی کا ذکر مت کرو۔ یہ سب گندی اور رذیل باتیں ہیں۔ اس سے ڈرائینگ روم کی فضا گندی ہوتی ہے۔

بات کرو شبِ فراق کی۔ رُخِ زیبا کی۔ کسی ظالم کی فراموش صفت آنکھوں کی۔ گیسوئے لیلائے شب کی۔ جوئبارے، مشکبارے گیسوئے آہوئے لیلائے ختن ۔ .... ہائیں ۔ کیا بکواس کرتے ہو۔ اتنی اتنی اضافتیں اکدم سے لگا دیں ۔ جانتے نہیں ہو۔ اعلیٰ ادب میں صرف دو اضافتیں جائز ہیں ۔ زندگی میں چاہے آٹھ بچے ہو جائیں اور نو اضافتیں لگ جائیں مگر اعلیٰ ادب میں صرف دو اضافتیں جائز ہیں۔ اور صرف ایک موضوع ۔ عورت!"

پرویز میری باتیں خاموشی سے سُنتا رہا۔ اُسے معلوم تھا کہ جب میرے سامنے لوکی آجائے تو میں اسی طرح بہکتا ہوں جیسے لوگ شراب پی کر بہکتے ہیں۔

اُس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کسی طرح آج تو تم لوکی کھالو۔ کل صوفی کی جگہ اس کی چھوٹی بہن ٹریسا آرہی ہے۔ اس سے نئے مینو کی سفارش کریں گے تمہارے لئے۔"

"اور صوفی کہاں جارہی ہے؟" میں نے بدقتِ تمام لوکی کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"صوفی اپنے وطن جارہی ہے ڈیڑھ ماہ کے لئے۔"

میں نے لوکی کھاتے ہوئے کہا۔

"پرویز! اگر کل سے اِس بورڈنگ ہاؤس میں مجھے لوکی ملی تو میں بورڈنگ ہاؤس ہی چھوڑ دوں گا۔ میں اپنی جان دے دوں گا۔ خودکشی کرلوں گا... مگر...."

مگر دوسرے روز مجھ سے بورڈنگ ہاؤس چھوڑا نہ گیا۔ حالانکہ دوسرے روز صوفی کی جگہ ٹریسا آگئی تھی۔ اور ٹریسا نے بھی لوکی ہی تیار کی تھی۔

گو لوکی وہی تھی مگر لڑکی وہی نہ تھی۔ ٹریسا بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔ اور وہ لنچ کی ٹرے اٹھا کر میرے سامنے رکھ رہی تھی تو اسکی شانوں تک ننگی باہیں سیب کی سڈول ڈالیوں کی طرح جھکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ٹریسا ایک ایسے ثمردار درخت کی طرح حسین تھی جس پر پہلی بار پھول آئے ہوں۔ میں تو بس اُسے دیکھتا رہ گیا۔ پرویز نے انتہائی سنجیدہ رو ہو کر ٹریسا سے کہا۔

"میرا دوست آج نے تمہارا یہ بورڈنگ ہاؤس چھوڑ دے گا"

"کیوں؟" ٹریسا نے گھبرا کر اپنی آنکھوں کو میری طرف گھمایا۔

"اسے لوکی پسند نہیں ہے" پرویز شریر نگاہوں سے اُسے تاکتے ہوئے بولا۔

"لوکی پسند نہیں ہے؟" ٹریسا نے میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے اُسے میرے آدمی ہونے میں شُبہ پیدا ہو چلا ہو "لوکی تو میں اس قدر عمدہ پکاتی ہوں اس قدر عمدہ کہ سب تعریف کرتے ہیں آج کی لوکی تو میں نے ٹماٹر کے جُوس میں دھیرے دھیرے مدھم مدھم آنچ پر پکائی ہے۔ کھا کر دیکھیئے۔ بالکل گوشت کا سا مزا آئے گا۔ کیا واقعی آپ کو لوکی پسند نہیں ہے؟" ٹریسا نے میری طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا ـــــ اور میرا دل وہیں موم بتی کی طرح پگھلنے لگا۔

"نہیں نہیں ـــ یہ بات نہیں ہے" میں نے مسکرا کر ٹریسا سے کہا "مجھے تو دراصل لوکی اتنی ہی خوبصورت معلوم ہوتی ہے جتنی تمہاری ایسی خوب صورت عورت"

ٹریسا ہنسی۔

"بھلا عورت اور لوکی میں کیا مشابہت۔ اب تم بہت دور کی

بات کرنے لگے ہو مسٹر"

"گدھا ہے یہ" پرویز ثریا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کے لیے میرا مذاق اڑانے لگا۔

"نہیں ثریا۔ عورت اور لوکی میں غضب کی مشابہت ہوتی ہے۔ عورت کی طرح لوکی کا سر بھی چھوٹا ہوتا ہے اور دھڑ موٹا ہوتا ہے۔ عورت کی طرح لوکی کی جلد بھی بے حد ملائم اور چکنی ہوتی ہے۔ خوبصورت عورت کی طرح اچھی لوکی کا رنگ بھی زیتونی ہوتا ہے۔ اور جب ہوا کے جھونکے سے ہری ہری بیل پر لوکیاں جھومتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شوخ و شنگ لڑکیاں چہل قدمی کرنے کے لئے جا رہی ہوں"

ثریا نے خوشی سے تالی بجائی اور میرے قریب میز پر بیٹھ گئی۔

پرویز کا رنگ اُڑ گیا۔

میں نے کہا۔

"اچھی لوکی اچھی عورت کی طرح دل کی بڑی نرم ہوتی ہے۔ حسین عورت اور حسین لوکی دونوں کو عمر طبعی تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔ پہلے ہی سے توڑ لیا جاتا ہے۔ لوکی کوئی کدّو اور ٹماٹر کی طرح نہیں ہے کہ جب تک پختہ عمر کو نہ پہنچ جائے بے کار رہے۔ لوکی تو جتنی کم عمر کی ہوگی اُتنی ہی مزے کی ہوگی۔ بھلا بڈھی لوکی بھی کسی نے کھائی ہے؟۔ بڈھی لوکی کی رنگت پیلی پڑ جاتی ہے۔ اس کی کھال سخت اور جھرّی دار ہو جاتی ہے۔ اندر سے گودہ سڑ جاتا ہے۔ بیج کھانسی کے بلغم کی

طرح اندر ہی اندر کھنکنے لگتے ہیں ۔ اُس عمر میں لوگ لوکی کے بیج نکال کر اُس کا جھانواں بناتے ہیں اور اُس سے گندے برتن صاف کرواتے ہیں، بڈھی عورتوں کی طرح .....

لیکن جوان لوکی کی گردن، ہائے ٹریسا! بالکل تمہاری گردن کی طرح صُراحی دار ہوتی ہے ۔ اور ..... اس میں ایسی ہلکی ہلکی سی مہک آتی ہے .... جیسے جوانی میں خوب صورت عورت کے بدن سے آتی ہے ۔ ذرا میرے قریب آؤ۔"

"بس ... بس" ٹریسا ہنستے ہنستے شرما گئی اور فوراً وہاں سے بھاگ گئی ۔

مگر اُس دن کے بعد سے ڈیڑھ ماہ تک ٹریسا نے مجھے لوکی نہیں کھلائی ۔ عورت اپنے مقابلے میں کسی دوسرے کی تعریف برداشت نہیں کر سکتی ۔ چاہے وہ لوکی ہی کیوں نہ ہو ۔ اور یہ میرے حق میں بہت اچھا ہوا ۔ میں لوکی کھانے سے بچ گیا ۔ آدمی ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہے ۔ یا عشق کرے یا لوکی کھائے ... !

ڈیڑھ ماہ کے عرصے کے بعد جب صوفی واپس آئی تو میری شادی ٹریسا سے ہو چکی تھی ۔ مگر ہنی مون منانے کے بعد پھر سے ہمارے گھر میں لوکی کی آمد و رفت شروع ہو گئی ۔ دو چار روز تو میں نے صبر کیا ۔ آخر ایک دن میں نے جھلا کر کہا ۔

"یہ کیا مذاق ہے ؟ ہر روز وہی لوکی ؟ لوکی ؟ لوکی ؟ ۔ کیا لوکی کے

سوا اور کوئی سبزی نہیں ہے اس دُنیا میں؟"

میری آواز سُن کر صوفی اور ٹریسا دونوں باورچی خانے سے باہر دوڑیں ایک کے ہاتھ میں چمٹا تھا، دوسری کے ہاتھ میں بیلن تھا۔ دونوں نے اِکدم غضبناک ہو کر کہا۔

"کیا ہے؟ کیوں شور مچا رہے ہو؟"

میں دونوں بہنوں کو دیکھ کر سہم گیا۔

آخر میں نے آہستہ سے اپنی نظریں جھکا لیں اور دھیرے سے مسکین لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں۔ اِس پلیٹ میں تھوڑی سی لوکی رکھ دو۔"

کبوتر کے خط

مستان تلاؤ۔
بھائی ونڈ۔
مورخہ اٹھارہ اپریل سنہ ۱۹۵۹ء

میرے کرشن بھگوان!
ڈنڈوت پرنام۔!

آپ کو یہ خط پاکر بڑی حیرت ہوگی۔ اچنبا بھی ہوگا۔ یہ کونسا بے وقوف ہے جو مجھ کو جان پہچان کے بغیر خط لکھ رہا ہے۔ میرا دل بھی ایک عرصے سے آپ کو خط لکھنے کا کرتا تھا مگر ڈرتا بھی تھا، کارن یہ کہ میں آپ کا ایک بھگت ہوں اور بھگت بھی ایسا جس نے آپ کی ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ باون پتے۔ گدھے کی سرگزشت، تین غنڈے

مچھلی ، جال ، شکست ، شکست کے بعد ، سرائے کے باہر ،
آسمان روشن ہے ، صبح ہوتی ہے ۔ سب پڑھ چکا ہوں ۔ یقین
مانئے ۔ وشواش کرلو ۔ میں تو پڑھ پڑھ کر حیران ہوتا ہوں ۔ اور
حیران ہو ہو کر پڑھتا ہوں ۔ کیونکہ آپ کی قلم میں جادو ہے ۔
جادو ! آپ جو لکھتے ہو وہ دل میں اُتر جاتا ہے ۔ آپ کا تیکھا
طنز ، ظالموں پر چوٹ ۔ غریب اور دُکھیوں کے ساتھ ایسی
ایسی باتیں ہم کو آپ کی کہانیوں اور ناولوں میں ملتی ہیں کہ کیا
بیان کروں اور خوب صورتی کا جو سماں آپ باندھتے ہو اُس سے
تو میرا دل غش کھانے لگتا ہے ۔ چھوٹا مُنہ اور بڑی بات ہوگی
مگر سچ مانو میں تو اِس غریبوں کی دُکھی دُنیا میں آپ کو اوتار سمان
سمجھتا ہوں ، دل سے آپ کی پوجا کرتا ہوں ۔ آپ بہت بڑے
بہت بڑے مہان ادیب ہیں ۔ میں ایک غریب رفیوجی ہوں
جو پاکستان سے لُٹ لُٹا کر ہندوستان میں اپنی زندگی کے
دن پورے کر رہا ہوں ۔ میرا آپ کا کیا مقابلہ ؟ ۔ کہاں
راجہ بھوج ، کہاں گنگو اتیلی ! میں نے تو اسی کارن اتنے دن
آپ کو خط بھی نہیں لکھا کہ پروانہ اُس بڑے دربار میں تیری
رسائی کہاں ؟ مگر میری شردھا نے آخر میں مجبور کر دیا کہ میں
آپ کی خدمت میں اپنے ارمانوں کے گلہائے عقیدت نچھاور
کرتا جاؤں ۔ اُمید ہے کہ آپ سویکار کریں گے ۔ اور

مجھے اس خط کا جواب ضرور دیں گے۔ کیونکہ میں آپ کے ادب کی شمع کا پروانہ ہوں۔

اِدھر بھائی وِنڈ میں آپ کی دیا سے اور بھگوان کی کرپا سے میرا کام اچھا چل نکلا ہے۔ بھائی وِنڈ میں میری نگینہ بیکری ہے۔ جس کی ڈبل روٹیاں ہمارے شہر میں مشہور ہیں اگر کبھی آپ اِدھر تشریف لاویں تو آپ کو ایسی عمدہ ڈبل روٹیاں کھلاؤں گا کہ آپ کھا کھا کر عش عش کرنے لگیں گے اور بھائی وِنڈ بمبئی سے ایسا کوئی زیادہ دور بھی نہیں ہے صرف ایک سو یا ڈیڑھ سو میل دور ہوگا۔ اگر آپ کبھی بھائی وِنڈ آویں تو میں سمجھوں گا کہ کیڑی کے گھر بھگوان آگئے۔!

نگینہ بیکری پر میرا چھوٹا بھائی لوڑ نیدامل بیٹھتا ہے۔ اور میں اپنی بزازی کی دوکان "بالے دی ہٹی" پر بیٹھتا ہوں میری "بالے دی ہٹی" بھائی وِنڈ میں کپڑوں کی سب سے بڑھیا دوکان ہے۔ میں آپ کی خدمت میں الگ پارسل سے گرم سوٹ کا تین گز کا ایک ٹکڑا بھیجتا ہوں۔ اس کو ایک غریب مگر اپنے چاہنے والے بھگت کا کچھ تحفہ سمجھ کر سویکار کرتیں اور رسید سے فوراً مطلع کریں۔

وہ دن میری زندگی کا سب سے خوش قسمت دن ہوگا

جس دن میرے بھگوان میری سُنیں گے اور اپنے ہاتھوں سے مجھے خط لکھ کر میرا جیون کرتارتھ کریں گے۔ میں ہر روز آپکے خط کی آشا کرتا رہوں ۔

آپ کا اپنا بھگت :
گھسیٹا رام پروانہ۔

مستان تلاؤ۔
بھائی ونڈ۔
مؤرخہ بیس مئی سنہ ۱۹۵۹ء

میرے اچھے اور عظیم ادیب کرشن چندر جی مہاراج!
بعد از نمستے اور بندے ماترم کے معلوم ہو کہ عرصہ دراز سے آپ کا کوئی خط پتر نہیں آیا ہے۔ وجہ نامعلوم ۔ میں نے ایک خط آپ کے نام اٹھارہ اپریل کو لکھا تھا جس کا ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا ہے۔ ایک کپڑے کا ٹکڑا گرم سوٹ کا بھی بھیجا تھا، جس کی رسید آپ کے ہاتھ کے دستخط والی مل گئی۔ رسید پر آپ کا نام دیکھ کر میں نے

نہ ہوئی۔ وہ ایک گھریلو لڑکی تھی، اُسے کھانا پکانا، سینا پرونا، کپڑے دھونا۔ جھاڑو دینا اور اپنے شوہر کے لئے سوئٹر بُننا بہت پسند تھا۔ وہ چودہ روپے کی ساڑھی اور دو روپے کے بلاؤز میں بے حد حسین خوش اور مگن تھی۔ نہیں، وہ کبھی بمبئی نہیں جائے گی۔ وہ کسی اسکول میں کام کرے گی مگر بمبئی نہیں جائے گی۔

پہلے دو تین دن تو مدن اُسے سمجھاتا رہا۔ جب وہ کسی طرح نہ مانی تو وہ اُسے پیٹنے لگا۔ دو دن چار چوٹ کی مار کھا کر پریم لتا سیدھی ہوگئی اور بمبئی میں جانے کے لئے تیار ہوگئی۔

جب پریم لتا اور مدن بوری بندر کے اسٹیشن پر اُترے تو اُنکے پاس صرف ایک بستر تھا۔ دو سوٹ کیس تھے۔ چند سو روپے تھے۔ اور پریم لتا کے جہیز کا زیور تھا۔ چند دن وہ لوگ کالبا دیوی کے ایک دھرم شالے میں رہے اور مکان ڈھونڈھتے رہے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ جتنے کا زیور پریم لتا کے پاس ہے اور جتنے روپے مدن کے پاس ہیں وہ کل ملا کر بھی اتنے نہیں ہو سکتے کہ بمبئی میں پگڑی دے کر ایک مکان لیا جائے۔ تو وہ لوگ دھرم شالے سے گورے گاؤں کی ایک جھونپڑی میں منتقل ہوگئے۔ جہاں سب سے پہلے مدن کی لڑائی جھونپڑی میں رہنے والے ایک غنڈے سے ہوئی جو شراب پی کر پریم لتا کی عزت پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اُس لڑائی کے ایک زخم کا نشان آج بھی مدن کی کلائی پہ موجود تھا۔ مگر مدن نے بڑی بہادری اور جیداری سے لڑ کر جھونپڑیوں

اُسے ماتھے سے لگالیا اور اپنے من میں کہا کہ یہ اُس مہان ادیب کا دستخط ہے جس کے ایک حرف سے لاکھوں لوگوں کو زندگی کا سچا سبق ملتا ہے ـــ جو لوگوں کے فائدے اور اُن کی بھلائی کے لئے لکھتا ہے۔ اور جس کے بھگت سینکڑوں، ہزاروں، ہندوستان، افغانستان، ایشیا، اور روس اور یورپ میں پائے جاتے ہیں۔ کرشن چندر جو غریبوں کا دیوانہ ہے!۔ جس کا چاہنے والا گھیٹا رام پروانہ ہے۔

مگر آپ کا خط نہیں آیا۔ وجہ نامعلوم؟ میں نے اپنی نگینہ بیکری میں بھائی لوڑ نیدامل سے بھی پوچھا تھا۔ مگر آپ کا پتہ وہاں پر بھی نہیں آیا۔ میری "بانے دی ہٹی" پر بھی نہیں آیا ـــ گھر پر بھی نہیں آیا ـــ وجہ نامعلوم؟۔

آپ ضرور میرے خط کا جواب دیویں۔ میں نے بڑی حسرتوں سے آپ کو خط لکھا ہے ـــ میں نے آپ کی سب کتابیں پڑھی ہیں، ایک کتاب نہیں چھوڑی سب کی سب اپنی الماری میں بند کر کے رکھتا ہوں۔ کسی کو آپ کی کتاب پڑھنے کے لئے نہیں دیتا۔ اپنی

بیوی کو بھی نہیں دیتا۔

مجھ کو معلوم ہے، آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ مگر تو کیا ہوا؟ آپ کو ہم غریبوں کا بھی خیال کرنا چاہیئے۔ کبھی میں دل میں سوچتا ہوں۔ بھگوان نہ کرے آپ بیمار ہوں۔ شاید آپ کسی تکلیف کے چکر میں پڑ گئے ہوں گے مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ تو سب کا اچھا چاہتے ہیں۔ آپ کو بھگوان کبھی تکلیف نہیں دے سکتا مگر آپ نے اب تک میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ وجہ نا معلوم؟۔

لہٰذا اِس خط کا جواب ضرور دینا۔ جواب کے لئے واپسی لفافہ اِرسال کر رہا ہوں۔

آپ کا اپنا:

گھسیٹا رام پروانہ

مستان تلاؤ۔
کھائی وَنڈ

مؤرخہ دو۲ جولائی ۱۹۵۹ء

کرشن جی ۔۔!

دو خط آپ کی سیوا میں بھیج چکا ہوں۔ ایک کا بھی جواب نہیں آیا ۔ وجہ نامعلوم ؟ ۔

یقین مانو ! سچ بولتا ہوں۔ مجھے آپ سے اس طرح کے سلوک کی ذرا بھی اُمید نہ تھی ۔۔ میں نے تو اپنے دل کے من مندر میں آپ کی جو تصویر بنا رکھی تھی اس کو آپ نے اپنے نقش قدم سے چکنا چور کر کے خاک کر دیا ہے ۔۔ ایسا بھی کیا ؟ آخر ہم

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

بھی انسان ہیں! آپ کی طرح دل رکھتے ہیں۔
کسی کے دل کو دُکھانا اچھا نہیں ہوتا۔ کسی شاعر کا
مقولہ ہے ؎

کسی کے دل کو دُکھانا اچھا نہیں ہوتا
جو گھر پر آجائے اس کو مٹانا اچھا نہیں ہوتا

لیکن اب بھی مجھے آپ کے فکرِ کرم سے یہ امید ہے
ہے آپ میرے خط کا جواب ضرور دیں گے۔ ضرور
خط لکھیں گے۔ مجھے نا اُمید اور نراش نہیں
کریں گے۔

لیکن آپ سے ایک نوید ن ہے۔ اگر آپ اب
مجھے خط لکھیں۔ تو نگینہ بیکری کے پتے پر نہ لکھیں۔
کیونکہ میں نے اپنے بھائی لوڑ ینداس کو وہاں سے
ہٹا دیا ہے۔ ہٹا کیا دیا ہے۔ وہ بدمعاش
خود ہٹ گیا ہے۔ وہ ہماری بیکری کے تنور میں
ڈبل روٹیاں پکانے والی لڑکی کو لے کر کہیں بھاگ کر
فرار ہو گیا ہے۔ اور دوکان کے تین سو روپے الگ لیکر
رفو چکر ہو گیا ہے۔

بولئے کیا زمانہ آیا ہے؟ بھائی بھائی کا
نہیں رہا۔

خون خون سے الگ ہو گیا ہے ۔ جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے ۔

کیا عرض کروں بہت دکھی ہوں ۔ ہر روز آپکی کتابیں پڑھتا ہوں ۔ اور ہر روز آپ کے خط کا انتظار کرتا ہوں ۔

دو سطروں کا ایک مختصر خط ہی لکھدو ۔ آپ کے لکھے ہوئے تین حرف بھی مامجھ کو مل جاویں گے تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت خیال کروں گا ۔ اُمّید کرتا ہوں کہ آپ یہ خط ملتے ہی بذریعہ ڈاک سے مجھے جواب دیں گے ۔

آپ کا :

گھسیٹا رام پروانہ

مستان تلاؤ۔
بھائی ونڈ۔

مورخہ دس اگست سنہ ۱۹۵۹ء

کرشن صاحب!
کیا بات ہے۔ میرے کسی خط کا جواب نہیں آتا؟
میں نے جناب خوشتر گرامی صاحب، ایڈیٹر
"بیسویں صدی" سے آپ کا پتہ منگایا تھا۔ اس لئے
پتہ غلط نہیں ہو سکتا۔ پھر کیا بات ہے؟ — وجہ
نامعلوم؟
میں ہر روز آپ کے خط کا انتظار کرتا اور شعر

پڑھتا ہوں ۔

خط کبوتر کس طرح لے جائے بامِ یار پر
پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

سچ کہتا ہوں ۔ اگر میں کبوتر ہوتا تو خط لکھنے کے بجائے خود اپنا سندیسہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ۔ مگر قسمت کی بات ہے ۔ میں اِدھر اپنے کام میں اتنا جکڑا گیا ہوں کہ بھائی ونڈ سے باہر نہیں نکل سکتا ۔

میری بیوی کی پیٹھ پر خارش نکل آئی ہے ۔ اور میرا سب سے چھوٹا بیٹا گھگھو جس کو ہم پیار سے گھُجّا بھی کہتے ہیں ، وہ آج کل دانت نکال رہا ہے ۔ پھر میری کپڑوں کی دوکان پر جو سیلز مین ہے کام کرتا تھا وہ پوپلین کے دو تھان چرا کر فرار ہو گیا ہے ۔

آپ غریب آدمی کی طرفداری تو کرتے ہو مگر غریب آدمی جب چوری کرتا ہے تو اس کو کچھ نہیں کہتے ہو کیا اسی کا نام ترقی پسندی ہے ؟ ۔

ادھر انکم ٹیکس والوں نے بھی مجھ کو بہت ستا رکھا ہے ۔ آپ انکم ٹیکس والوں کی بے رحمی پر ایک افسانہ

کیوں نہیں لکھتے ہو ؟ "

بہت کر کے میری ایک تمنّا بہت دنوں سے تھی کہ میں اپنی ایک تصویر آپ کے ساتھ کھنچاؤں ۔ مگر مجھ کو بھائی ونڈ کے کام سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی ۔ اگر آپ کبھی اِدھر آئیں تو میں آپ کو آنے جانے کا تھرڈ کلاس کا کرایہ دے دوں گا ۔ وہی سوٹ پہن کر آپ آنا جس کا کپڑا میں نے آپ کو پہلے خط کے ساتھ بھیجا تھا ۔

دیکھو تم میری تمنّا کب پوری کرتے ہو ۔ پہلے ایک خط کی آس تو پوری کر دو ۔ کب سے نظریں بچھائے بیٹھا ہوں ۔

فقط تمہارا ،
گھسیٹا رام پروانہ

مستان تلاؤ۔
بھائی ونڈ۔

مورخہ پندرہ ستمبر ۱۹۵۹ء

ابے اوکرشن کے بچّے!
تُو کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو؟ — تجھ کو پہلا خط اٹھارہ اپریل کو لکھا۔ دوسرا خط بیس مئی کو لکھا تیسرا خط رجسٹری سے دو جولائی کو روانہ کیا۔ چوتھا خط دس اگست کو لکھا۔ مگر تو نے کسی ایک خط کا جواب تک نہیں دیا؟۔ کیا انسانیت اسی کو بولتے ہیں؟ کیا اسی کا نام شرافت ہے؟۔ کیا بڑا ادیب وہی ہوتا ہے جو اپنی ہستی میں اس قدر مغرور ہو جائے کہ کسی کو کبھی